نگارشاتِ راشد

(مقالات ومضامین)

محمد اکرم راشد

(ایم اے۔ گولڈ میڈلسٹ)

نگارشاتِ راشد

(سکول، کالج اور مدارس کے طلبا و طالبات کے لیے انمول مضامین)

مصنف

حافظ محمد اکرم راشدؔ

(ایم۔اے گولڈ میڈلسٹ)

حُسنِ ادب، فیصل آباد

ASIAN RESEARCH INDEX

OPEN ACCESS

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

''جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں''

نام کتاب: نگارشاتِ راشد (مقالات)

نام مصنف: حافظ محمد اکرم راشدؔ

کمپوزنگ: محمد حامد جیلانی، حافظ نعیم اکرم عطاری

پروف ریڈنگ: حکیم محمد وسیم اکرم ، محمد نسیم اکرم بھٹی

نظر ثانی و تصحیح: پروفیسر اکرام تائب

سرورق: ام النجم بنت حافظ محمد اکرم راشد

معاونت: محمد بلال رضا عطاری، حیدر عباس بخاری

مشاورت: حافظ محمد فہیم اکرم ، حکیم قاضی جاوید اقبال

تحریک: محمد شریف طیب، محمد امین بھٹی

ناشر: حسنِ ادب فیصل آباد

سنِ اشاعت: 2021ء

قیمت: 500/-

ARI ID: 1689956699836

انتساب

اُن ایمان افروز، اور یقین افزا سخن ہائے شیریں لسان کے نام!
اُن بلند عزائم اور پاکیزہ مقاصد کے نام!
عشق و محبت کی اُن دلنوازیوں اور رعنائیوں کے نام!
اُن دعا ہائے نیم شبی، سخن ہائے گفتنی، اور گریہ ہائے سحری کے نام!
اُن تصوّرات، تخیلات اور نگارشات کے نام!
جن سے

پدر بزرگوار عزت مآب حضرت علاّمہ حافظ اللہ یار رحمۃ اللہ علیہ اور میرے حقیقی چچا و استاذِ محترم حاجی شیر علی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیر پر تقصیر کو سرفراز فرمایا اور وہ اس اہل ہوا کہ تحریری صورت میں موجود مواد کی شکل میں خدمتِ خلق کے جذبے کو پروان چڑھا سکے اور اپنا حصّہ بقدر جُثہ شامل کر سکے۔

ملنے کے پتے

صوفی کتاب گھر

جناح چوک عارف والا فون: 0301-6642152

محبوب بک سنٹر، ریل بازار عارف والا

الہلال بک ڈپو

ریل بازار عارف والا فون: (0457) 832899

مکان نمبر 82- رحیم ٹاؤن عارف والا۔

رابطہ نمبرز:

0346-2398606 0300-8657606 ,

0301-4129160 0302-5108642

0301-5039157 , 0307-0329283

فہرست مضامین

عنوانات		صفحہ نمبر
کتاب اور صاحبِ کتاب کی نظر	پروفیسر اکرام تائب	9
کچھ یادیں کچھ باتیں	سید الف۔ عین اللہ شاہ	10
تقریظ اوّل	پروفیسر حافظ محمد علی	12
تقریظ دوم	پروفیسر اکرام تائب	13
تقریظ سوئم	رانا محمد اظہر خاں	14
نگارشاتِ راشد پر ایک طائرانہ نظر	اللہ یار ثاقب	15
''نگارشاتِ راشد'' اور صاحبِ کتاب	سید خلیل الرحمٰن شاہ بخاری	16
وجہ تالیف	حافظ محمد اکرم راشد	18
کچھ مصنف کے بارے میں	حکیم قاضی محمد اقبال اسد	20
مضامین		21
عدلِ اجتماعی کا تصور و اہمیّت		22
احترامِ آدمیت		38
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر		40
پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیاری باتیں		42
میلادُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم		44
صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے ہے خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بس		48
سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ		52
حضرت امامِ اعظم (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ)		55
ریاست کا عزم: فرقہ واریت اور متشدّد رویوں کا خاتمہ		59
محنت کی عظمت		61
تعلیم کی اہمیّت		62

استاد کی عظمت	64
مایوسی گناہ ہے	66
علم کے فائدے	68
سانچ کو آنچ نہیں	70
اسلام رواداری کا علمبردار	72
زندگی خدا کی نعمت ہے	75
اتفاق میں برکت	77
صراطِ مستقیم	78
خودشناسی خداشناسی ہے	79
والدین کا مقام	81
صلوۃ التراویح اور جسم انسانی	84
فلسفہ قربانی	86
شبِ برات اور آتشبازی کی قبیح رسم	88
تعلیمِ نسواں	92
قیام پاکستان اور قرآن	94
افراد کے ہاتھوں میں اقوام کی تقدیر	97
ہم ہیں وطن کے پاسباں/ ہم وطن کے محافظ	99
اچھے شہری کی ذمّہ داریاں	101
انگریزی بذریعہ تعلیم ہماری ضرورت	103
صحت وصفائی	105
صبح کی سیر	107
ایٹمی توانائی کا پُرامن استعمال	109
ملکی وسائل اور ان کا استعمال	111
نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا	113

لائبریری کی اہمیّت	115
مار نہیں پیار	118
شرح خواندگی اور معاشی خوشحالی	121
توانائی اور ملکی ترقی	123
فرقہ بندی مسلمانوں کا بڑا المیہ ہے/ چیلنج ہے/ خطرہ ہے	125
کھیل اور تعلیمی درسگاہیں	127
تعلیمی اداروں میں کھیلوں کی اہمیت	129
نظم وضبط	132
میری جان پاکستان	135
کتاب بہترین دوست	137
شہید کی جو موت ہے وُہ قوم کی حیات ہے	139
تعلیم میں کمپیوٹر کا کردار	140
بجلی کے بحران پہ کیسے قابو پایا جاسکتا ہے	144
نوجوانوں کا اخلاقی بحران	146
بیماری سے مقابلہ	148
سیلاب کی تباہ کاریاں	149
ماحول کی آلودگی	151
زندگی میں عمل کی اہمیت	153
گالی گلوچ (زبان کا غلط استعمال)	156
جہالت ترقی کی دشمن ہے	158
چلے چلو کہ ہے، منزل ابھی نہیں آئی	161
جمہوریت بہتر یا آمریت	164
مضبوط معیشت مضبوط پاکستان کی ضمانت ہے	166
ڈینگی مکاؤ مہم میں معاشرے کا کردار	168

ڈینگی بخار قابلِ علاج ہے	170
سائنسی ایجادات	172
پن بجلی کی اہمیت	174
بیماری سے بچاؤ کے لیے ریاست اور عوام کا کیا کردار ہے	176
بدعنوانی کے خاتمے میں معاشرے کا کردار	180
میرا ٹیچر	182
آبی وسائل کی اہمیّت	184
کیا توانائی کے بحران کا حل ہمارے بس میں نہیں	186
دہشتگردی ایک المیہ ہے	189
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری	192
تندرستی ہزار نعمت ہے	194
پاکستان میری جنّت	196
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی	198
علامہ اقبال کی طلباء سے توقعات	201
آمریت سے ہی پاکستان کا مستقبل ہے	203
جمہوریت سے ہی پاکستان کا مستقبل ہے	205
خود روزگاری کیوں اور کیسے	207
آزادی ایک نعمت ہے	209
آدمی ہیں بے شمار مگر انسان کوئی نہیں	212
تعلیمی انقلاب تقاضائے وقت	214
مسلسل جدوجہد کامیابی کی کنجی ہے	217
حقوقِ انسانی کا اسلامی تصور	219

☆☆☆☆☆☆☆

کتاب اور صاحبِ کتاب کی نذر

لعل و گوہر سے گراں تر اُن کی یہ تحریر ہے
ہے یہی تختِ شہی ، اُن کی یہی جاگیر ہے
علم سے بڑھ کر کوئی بھی نعمتِ کبریٰ نہیں
علم طاقت، علم دولت، علم ہی شمشیر ہے
اِس میں غوطہ زن تمہیں ہونا ہے میرے دوستو
وقت کا جو خواب ہے اُس کی یہی تعبیر ہے
اختصار و جامعیت کی مرقعّ ہے یہی
بند کوزے میں سمندر ، ان کی ہر تقریر ہے
کس قدر گہری نظر ہے اِن کی سب حالات پر
وقت کے نباض کی منہ بولتی تصویر ہے
چار گوشہ اُن کی شخصیت ہے خود ہی دیکھ لو
اِک مدرس، ایک عالم ہے ،خطیب اور پیر ہے
ظلمتِ شب میں فروزاں نور کا مینار ہیں
سَیف ہے اُن کی زباں ، ہر لفظ میں تاثیر ہے
اک خزینۂ گراں مایہ ہے اُن کی پیشکش
ہر مدرس ، ہر مقرر کے لیے اکسیر ہے
حضرت راشدؔ کی کاوش مرحبا ، صد مرحبا
اِن کا اِک اِک حرف تائبؔ نعرۂ تکبیر ہے

پروفیسر اکرام تائب

سابق صدر شعبہ (اردو ادبیات)

گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج عارف والا

کچھ یادیں کچھ باتیں

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں رسمی تعلیم کے ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھنے کی جستجو میں تھا کہ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے زندگی میں درپیش مسائل سے نبرد آزما ہونے میں بہت مدد کی اور اب بھی تادمِ تحریر اِن کے علمی و ادبی فیض سے استفادہ جاری ہے۔

جون ۱۹۹۲ء کی بات ہے کہ خالد بھٹی (مرحوم) نے اپنے حاوی کالج میں طلباء کی خوشنویسی کی تربیت کے لیے بطور خوش نویس معلم مجھے خدمات سرانجام دینے کے لیے آمادہ کیا اور اسی سلسلہ میں ایک اشتہار "حاوی کالج کی فخریہ پیشکش" تدریسِ خطاطی کی باقاعدہ کلاس کی کتابت کے لیے خالد بھٹی کے ہمراہ اِن کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا تو دیکھا کہ ایک تیس بتیس سالہ خوش شکل، خوش رنگ، خوش لباس، دبلا پتلا، باریش شخص سامان کتابت کے ساتھ اپنی مسندِ خاص پر براجمان ہے اور جلد ہی یہ احساس بھی ہوا کہ وہ خوش اخلاق اور مہمان نواز بھی ہے۔ ازاں بعد ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ رب کریم کی مجھ پر کرم نوازی ہوئی کہ مارچ ۱۹۹۳ء میں میں اُن کا رفیق کار بن گیا اور ہم گورنمنٹ مڈل سکول نمبر ۲ میں اکٹھے رہے۔ اُن سے رفاقت کا سلسلہ جیسے طول پکڑتا گیا۔ اُن کی شخصیت کے ہر پہلو سے مجھے آشنائی ہوتی گئی۔

۱۹۶۲ء میں عارف والا کے مضافاتی شہر چک نمبر ۳۷/۱ ای۔ بی میں جنم لینے والا محمد اکرم جس نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ محترم سے حاصل کی اور محض چھ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پھر یتیمی کی ستم ظریفی اور غریب الوطنی کی پُرخار راہوں سے گزرتے ہوئے میٹرک کا امتحان ۱۹۷۸ء میں، ایف۔ اے ۱۹۸۰ء میں پاس کرنے کے بعد حفظِ قرآں کے لیے کچھ عرصہ جامعہ حنفیہ رضویہ عارف والا میں گزارنے کے بعد شمس العلوم کراچی کا رُخ کیا، اور پھر پاکستان کے سب سے بڑے علمی شہر میں مختلف درسگاہوں سے فاضل اردو، فاضل عربی اور اور فاضل درس نظامی کی سندات امتیازی حیثیت سے حاصل کیں۔ فاضل طب و جراحت کا کورس اعظم طبیہ کالج حیدرآباد سے کیا اور ساتھ فنِ کتابت میں مہارت حاصل کی جس کے لیے پنجاب کے مایہ ناز خطاط اور ادارہ دارالتحریر کے بانی جناب محمد اقبال سعید سے باقاعدہ ٹریننگ حاصل کی اور اس کے بعد روزنامہ انقلاب، نوائے وقت، مشرق اور دیگر معروف جرائد میں کتابت کے ذریعے اپنے سلسلہ روزگار کی ابتداء کی۔ اسے علمی و ادبی ماحول کا اثر کہیں یا پھر طبیعت کا ذوق تصور کریں روایتی ایف۔ اے کے بعد ۱۹۸۸ء میں بی۔ اے میں بہاؤ الدین

زکریا یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں ڈویژن حاصل کی۔ اور اس کے بعد اورینٹل ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور پھر علمی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ۱۹۹۰ء میں ایم۔اے اسلامیات، ۲۰۰۱ء میں ایم۔ایڈ اور ۲۰۱۰ء میں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی سے ایم۔اے عربی میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول 143/E.B میں بطورِ ہیڈ سر کام کر رہے ہیں اور ساتھ دینی خدمات کے طور پر محمدی مسجد N۔ بلاک کی امامت وخطابت کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنی علمی وادبی تحریروں اور مقالات کے ذریعے ادبی دنیا میں اپنا تشخص برقرار رکھا ہوا ہے۔ اور اب بوقت طباعت کتاب ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔

اکرم راشد کی ادبی زندگی کا آغاز:۔

اِن کی ادبی زندگی کا آغاز تقریباً ۱۹۹۲ء سے ہو گیا تھا۔ علاقائی روزناموں اور جرائد کے علاوہ پاکستان کے معروف اخبارات روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ ایکسپریس میں بھی اِن کی تحریریں چھپ چکی ہیں، تحریر میں اپنا ایک منفرد انداز رکھتے ہیں قاری دورانِ مطالعہ بوریت محسوس نہیں کرتا اور کافی دیر تک مطالعہ میں مستغرق رہتا ہے۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے منعقدہ مقابلہ مقالہ سیرت میں آپ کا مقالہ بعنوان عدل اجتماعی کا تصور اور اس کی اہمیت تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں طباعت کے لیے منتخب کر لیا گیا اور باقاعدہ کتاب چھپوا کر اکرم راشد کے پاس بھیج دی۔ موصوف کا یہ مقالہ جو تقریباً 15 صفحات پر مشتمل ہے، آپ کی اس کتاب ''نگارشاتِ راشد'' میں موجود ہے۔

اکرم راشد کی کتاب ''نگارشاتِ راشد'' میں جہاں یہ محاسن جیسے جدت پسندی، ربط تسلسل، حسنِ توازن، مذہبی رجحان، رعایتِ لفظی، حقیقت نگاری، گہرائی، گیرائی، مزاج وشگفتگی، مکالمہ نگاری، اور اس قسم کی دیگر خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں وہاں کچھ معائب بھی ہیں جن کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مثلاً لفاظی، فلسفہ نگاری مقفّع و مسجع عبارات، بے جا طوالت یہ چیزیں تحریر میں جاذبیّت کے منافی محسوس ہوتی ہیں۔ مجموعی صورت میں یہ کتاب طلباء کے لیے بالخصوص اور عام قاری کے لیے بالعموم ایک عظیم تحفہ ہے۔ میں نے اپنی معلومات کے مطابق ان کے بارے میں اظہار کیا ہے۔ اب قاری فیصلہ کرے گا کہ یہ کہاں تک درست ہے۔

سیّد الف عین اللہ شاہ

عارف والا

تقریظ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہِ الکریم

محترم حافظ محمد اکرم راشدؔ صاحب جو ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور اپنی اس وارثت کو جو علم کی صورت میں انہیں اپنے آباء واجداد سے ورثے میں ملی ہے تشنگانِ علم کو منتقل کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ تدریس ہو، تقریر ہو، تحریر ہو، میدانِ کتابت ہو پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی سے ایم۔اے عربیک میں گولڈ میڈل حاصل کیا ہے جو ہمارے علاقہ کے لئے اعزاز ہے۔ انہوں نے ''نگارشاتِ راشد'' کے نام سے ایک فقید المثال کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔

کتاب ''نگارشاتِ راشد'' جو مضامین پر مشتمل ہے اور اپنے اندر ندرت لیے ہوئے ہے یہ کتاب اپنے موضوع اور کتابت دونوں کے اعتبار سے نابغۂ روزگار ہے۔ اس میں عوام النّاس کے لیے بالعموم اور طلباء کے لیے بالخصوص علمی مواد موجود ہے۔ طلباء کے لیے ترغیبی انداز اختیار کیا گیا ہے، مختلف موضوعات پر موصوف نے اختصار مگر جامع انداز اختیار کیا ہے، اور یہ مقالات اپنے اندر علم وآگہی کا ایک وافر سامان لیے ہوئے ہیں، موصوف چونکہ مختلف جرائد اور روزناموں میں اپنی تحریر کے گُل کھِلاتے رہتے ہیں اس لیے آپ کی اس کتاب ''نگارشاتِ راشد'' میں قاری کا تجسّس بڑھتا جاتا ہے اور صاحبِ تحریر کا جذبہ خدمت خلق پروان چڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مختلف موضوعات پر مقالات تحریر کر کے طالب علم کی ضرورت کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ اِن کی مذکورہ کتاب مصنّف کے علمی تبحر کی گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اِن کی اس کاوش کو مقبول فرمائے۔

پروفیسر حافظ محمد علی

سابق پرنسپل پوسٹ گریجوایٹ کالج

بورے والا

تقریظ دوئم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہِ الکریم

زیرِنظر کتاب ''نگارشاتِ راشد'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے مختلف مقامات پر بنظر تعمق توجہ کی جس کو پڑھ کر انتہائی مسرّت ہوئی کہ حافظ محمد اکرم راشدؔ نے انتہائی محنت، لگن اور خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار ہو کر عوام النّاس کے لیے بالعموم اور طلباء کے لیے بالخصوص مقالات کے مجموعہ کو'' نگارشات راشد'' کے عنوان سے مُدّون کیا۔ جس کی عصرِ حاضر میں بہت ضرورت ہے۔ اِن تقریروں اور تحریروں کے مجموعہ سے طلباء کو مضمون اور تقریر کے تیار کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ موصوف نے اپنی اِن تحریروں کے ذریعے ترغیبی انداز اختیار کرتے ہوئے دینی نقطۂ نظر سے بھی شائقین مطالعہ کی راہنمائی کی ہے۔ یہ طلباء کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ تحریر میں جامعیت، اختصار، مناسبت، روانی اور مقفّع و مسجّع عبارتیں موصوف کی اِس فن سے آشنائی پر دَال ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

یہ گزارشاتِ راشد
یہ سفارشاتِ راشد
حکمت کا ہیں خزینہ
یہ نگارشاتِ راشد

امین بجاہ سید المرسلین

پروفیسر اکرام تائب

سابق صدر شعبہ (ادبیات اردو)

گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، عارفوالا

تقریظ سوئم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہِ الکریم

مُوصوف ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دینی علوم کے حوالے سے ان کے بزرگوں کی خدمات اظہر من الشّمس ہیں۔ اِن کی کتاب ''نگارشاتِ راشد'' ایک علمی خزانہ ہے اِس میں طلباء و طالبات کے لیے متعدد مضامین شامل کی گئی ہیں۔ جو اپنی نظیر آپ ہیں حافظ محمد اکرم راشدؔ نے دیگر کتب اور مضامین سے خوشہ چینی کی بجائے فی البدیہہ مواد پیش کرنے کی مساعی جمیلہ کی ہے۔ اِن کی تحریر میں چاشنی اور ندرت ہے۔ اِن کے مضامین جو'' نگارشاتِ راشد '' کے نام سے زیورِ طباعت سے مرصعّ ومزیّن ہورہے ہیں عام قاری کے لیے بالعموم اور طلباء و طالبات کے لیے بالخصوص ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔ ادارہ کے مقابلہ جات ہوں یا ضلعی اور ڈویژن لیول کے مقابلہ جات'' نگارشاتِ راشد'' میں شامل شدہ مضامین کفایت کریں گے۔ یہ طلباء کے لیے نعمت مترقبہ سے کم نہ ہے۔ موصوف کا ادبی دنیا میں ایک نام ہے اِن کو دیکھ کر متقدمین ادباء کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ دورانِ ملازمت بھی ادبی پروگرام کے حوالے سے محکمہ تعلیم میں اِن کی تحریریں محوگردش رہی ہیں۔ اور انعام واکرام کی حقدار گردانی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اِن کو مزید ایسے شاہ پارے پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رانا محمد اظہر خاں

چیف ایگزیکٹو آفیسر (ایجوکیشن)

ڈسٹرکٹ ایجوکیشن اتھارٹی، رحیم یار خاں

نگارشاتِ راشد پر ایک طائرانہ نظر

محترم حافظ اکرم راشدؔ کی ایک کتاب ''نگارشاتِ راشد'' پر کچھ لکھنا مجھ جیسے اردو کے ادنیٰ طالب علم کے لیے ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ راشد کے موضوعات کی حد مقرر کرنا ناممکن ہے۔ وسیع مطالعے کے بعد کشید کیا ہوا مضامین کا یہ مجموعہ قاری کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ جس میں وہ دنیا کے ساتھ ساتھ دین کے مسائل کو بھی سمجھ سکتا ہے۔ راشد نے اسلام، وطن، انسانیت، اخلاقیات، صحت، تعلیم، سماج، معیشت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے موضوعات کو قلم بند کیا ہے۔

اسلام کے حوالے سے کئی مضامین جن میں ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتیں'' اور ''میلادُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے علاوہ کئی ایسے مضمون لکھے ہیں جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی مبارک زندگیوں سے متعلق اہم واقعات بیان کیے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے حوالے سے ان کے مضامین حوالے کی چیز ہیں۔ انھوں نے تعلیم کی اہمیت و افادیت کے حوالے سے کئی مضامین قلم بند کئے ہیں جن میں علم کی روح تک پہنچنے کے لیے افکار واضح کیے ہیں۔ اسی طرح ان کے مضامین اخلاقیات، صحت اور جدید سائنس کے حوالے سے بھی اردو کا نایاب سرمایہ ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر اور ان پر عمل کر کے معاشرے میں عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

حافظ محمد اکرم راشدؔ ایک اچھے اور سچے مسلمان اور پاکستانی ہیں جن کے دل میں مسلمانوں کی اصلاح اور ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جس کا واضح ثبوت ان کی کتاب ''نگارشاتِ راشد'' ہے۔ یہ کتاب بھٹکے ہوئے انسان کے لیے ایک مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے اور وہ دین اور دنیا کے حوالے سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

اللہ یار ثاقب

ساہیوال

''نگارشاتِ راشد'' اور صاحبِ کتاب

حافظ محمد اکرم راشدؔ سے میرے دیرینہ اور دیرپا تعلقات ہیں، یہ ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن کے بزرگوں کے دینِ اسلام کے میدان میں لگائے ہوئے شجر سایہ دار مسحور کن ماحول پیش کر رہے ہیں اور تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کے لیے دورانِ سفر طلباء کے راستے میں آنے والی جہالت اور کم علمی کی تپش اور دھوپ کو رفع کرنے میں مثالی کردار ادا کر رہے ہیں۔ میں نے صرف کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں چند سطور ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے اپنے قلم کو اذنِ خرام دینا ہے۔ موصوف قلم کے میدان کے شاہسوار ہیں، ندائے حق کی ادارت ہو، منظور العارفین کی تدوین ہو، یا منظور العارفین ٹرسٹ کا قیام ہو، موصوف پیش پیش نظر آتے ہیں، آپ ہمارے ادارے منظور العارفین ٹرسٹ کے ساتھ قلب و اذہان کی جملہ قویٰ کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ مُرورِ ایّام کے ساتھ پیرانہ سالی اور ضعف کا شکار ہو کر کچھ عرصہ سے گوشہ نشین ہیں تاہم تحریر سے عشق کی حد تک لگاؤ کی بنا پر کوئی نہ کوئی شاہ پارہ تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ آپ کالم نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم خوش نویس بھی ہیں عارفوالا اور اس کے مضافات میں خطاطی کے حوالے سے ان کا ایک نام ہے۔ دنیوی اور دینی تعلیم کے امتزاج کے حامل ہیں اور اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ سرکاری ادارہ میں رئیس مدرسہ کے فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔

مذہبی خدمات کے حوالے سے اِن کی خدمات مہرِ نیم روز کی طرح واضح ہیں۔ مرکزی جامع مسجد N- بلاک عارفوالا کی امامت اور خطابت کے فرائض بحسن و خوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ صاحب ورع اور تقویٰ ہونا اِن کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے، علاقے کے اہم جرائد اور اخبارات میں ان کے مقالات زیورِ طباعت سے مزیّن اور مرصع ہو چکے ہیں۔ مسلک حق اہلِ سنت سے ان کی وابستگی اور قلبی لگاؤ اِن کا طُرّہ امتیاز ہے۔ جیّد عالم دین ہیں تنظیم المدارس کے امتحان میں ممتاز مع اشرف کے ساتھ واضح کامیابی کے بعد بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

سے ایم۔اے عربی میں طلائی تمغہ (گولڈ میڈل) حاصل کر کے پاکپتن میں بالعموم اور عارفوالا میں بالخصوص فضائے علم ومعرفت میں اپنے طائر خوش الحان کو محو پرواز کر چکے ہیں جو باشندگانِ علاقہ کے لیے ایک فخر کی بات ہے۔

''نگارشاتِ راشد'' آپ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً طلباء کے لئے تحریر کیے ہیں۔مختلف موضوعات پر مشتمل یہ مجموعہ عوام النّاس کے لیے اور طلباء وطالبات کے لئے بالخصوص ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ ہے۔آپ نے تقریر اور تحریر کے شائق طلباء کے لیے یادگار تحریں ''نگارشاتِ راشد'' کی صورت میں مرتب کی ہیں۔اِن میں طلباء وطالبات کے لیے نہ صرف وہ مقابلہ کے میدان کے لیے مواد فراہم کر رہے ہیں بلکہ دینی حوالے سے اِن نونہالانِ وطن کی تربیّت بھی ملحوظِ خاطر ہے۔یہ مضامین مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر انعقاد پذیر مقابلہ جات میں مختلف پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔یہ مقالات جو ''نگارشاتِ راشد'' کے نام سے موسوم ہیں تمام کے تمام طبع زاد ہیں۔اور ان میں اصلاح معاشرہ کی بھی کوشش کی گئی ہے۔اِس کے علی الرغم کتاب کی صورت میں اتنے مضامین کا یکجا مجلّد ہونا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔الفاظ کی بناوٹ،تراکیب کا استعمال،مقفعّ مسجع عبارتیں اور استعارہ کا استعمال موصوف کی اِس فن میں مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔راقم اِن کے اس فن سے عرصہ دراز سے واقف ہے،کیونکہ ہمارا لڑکپن،عالمِ شباب،اور اب عالمِ پیری بھی اکٹھا گزر رہا ہے۔ اوران کا شمار معاصرین خوش خصال میں ہوتا ہے۔

''نگارشاتِ راشد'' طلباء وطالبات کے لئے ایک انمول تحفہ ہے،اس کا مطالعہ طلباء کو دیگر کتب سے مقالات کے حوالے سے ان شاءاللہ العزیز بے نیاز کر دے گا اور اِن کا یہ تحریری کام اِن کے نام کو بھی زندہ رکھے گا۔اِن کے لئے نیک جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ اِن کے زورِ قلم میں اللہ تعالیٰ اور روانی عطا فرمائے۔

=اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ=

سید خلیل الرحمٰن شاہ بخاری

امیرِ اہلسنت (پنجاب) پاکستان

وجہ تالیف

انسان ہر میدان میں عروج کا خواہاں دکھائی دیتا ہے۔زوال نام سے خائف ہے، معاشی، معاشرتی، سیاسی یا روحانی میدان ہوخواہش اُس کی یہی ہوتی ہے کہ ان سب پر اُسی کا قبضہ ہواور دیگر حضرات اِن میادین میں اُس کی دریوزہ گری کریں، تحریر ہو، تقریر ہو، خطابت ہو، کتابت ہو، سب میدان اپنے نام کرنا چاہتا ہے۔لیکن یہ قانون قدرت ہے کہ ملتا وہی ہے جس کے لیے لیس للانسان الا ما سعی کے مصداق وُہ جہدِ مسلسل کرتا ہے۔ انسانی شخصیت میں جو شعبے نکھار پیدا کرتے ہیں وہ خطابت اور تحریر ہیں، مقالات وخطابت میں ،انسان اپنا مافی الضمیر یا تو اپنی زبان کی حرکت سے بیان کرتا ہے اور یا پھر قلم کو اذنِ خرام دے کر قرطاس ابیض پر کچھ رقم کر کے تخیلات وتصورات کو منصۂ شہود پر لا کر کرتا ہے۔ایّام زیست وحیات کے طائر خوش الحان کو محو پرواز رکھنے کے لیے تحریر وتقریر کی فضائے خوشگوار کی اَشد ضرورت ہے۔اسی فضاء میں زندگی کی گاڑی بطریقہ احسن اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو سکتی ہے۔ ان حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عوام النّاس کے لیے بالعموم اور طلباء کے لیے بالخصوص چند عنوانات پر مشتمل مضامین کا انتخاب کیا ہے جو طلباء میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ اُن کی معاشرتی زندگی میں بھی ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔ نیز ان کے لیے تحریر و تقریر کے میدان میں مہمیز ثابت ہوں۔ یہ چنگاری کافی عرصے سے اس وجودِ خاکی میں سلگ رہی تھی کہ کوئی تو ذریعہ ایسا سامنے آئے جس سے نونہالانِ وطن کے دماغ کے دریچوں کو جنبش دی جا سکے اور اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جا سکے۔ اِس میں جو خارجی عوامل میرے لیے مہمیز ثابت ہوئے وہ مثالی زکریا سکول عارف والا کے در ودیوار ہیں یہ جملہ مضامین اور تقاریر میں نے اپنے چار سالہ دورانیہ جو محترم محمد اصغر صاحب اور محمد سلیم صاحب پرنسپل صاحبان مثالی زکریا عارف والا کے ساتھ گزارا میں رقم کئے۔ اِن حضرات کے تعاون سے تحریر میں چاشنی پیدا ہوتی گئی اور میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ان میں اکثر مضامین اور تقاریر ایسی ہیں جو مقابلوں میں شامل ہو کر امتیازی پوزیشن حاصل کر چکی ہیں۔ اِس وقت اگر میں پروفیسر محمد اکرام تائب

صاحب کا ذکر نہ کروں تو انصاف نہ ہوگا۔ انہوں نے کتاب کی تدوین میں دامے، درمے، سخنے ہر لحاظ سے تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی اور یہ حوصلہ افزاء ماحول بھی پیدا کیا۔ نیز کتاب کی پروف ریڈنگ میں شب و روز ایک کر کے اغلاط کی واضح نشاندہی کی، احباب کا جمِ غفیر میرے تحریری ذوق سے آشنا تھا اور گاہے بگاہے اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے مجھے متحرک کرتا رہتا تھا۔ اس طرح ان کی کاوش بھی اس کتاب ''نگارشاتِ راشد'' کے منصۂ شہود پر آنے کا سبب بنی۔ محمد شریف طیب صاحب جو خود بھی نعت گو شاعر ہیں اس سلسلے میں وُہ بھی کافی پیش پیش رہے۔

اِس سلسلے میں اگر مرحوم حکیم محمد طفیل عابد جلالی کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ بہتر نہ ہوگا مرحوم میرے عم زاد تھے اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اُن کی تحریر میں ایک ندرت تھی۔ اور میری تحریر کی مشاطگی میں اُن کا وافر حصّہ موجود ہے یہ شاید اُنہی کی رفاقت تھی جو میرے لیے عزت کا باعث بنی۔

المختصر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہو تو تمام کوششیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل اور میرے بزرگوں کی دعائیں شامل حال ہوئیں تو ناچیز اس اہل ہوا کہ یہ علمی، ادبی سرمایہ پیشِ خدمت کر سکے۔

واضح رہے کہ پہلے مضامین اور تقاریر ایک ہی جلد میں طبع ہو رہے تھے۔ اب تقاریر کو ''نگارشاتِ راشد'' (خطبات) کے عنوان سے علیحدہ طباعت کے مراحل سے گزارا جا رہا ہے تا کہ قاری دونوں کتابوں کا مطالعہ آسانی سے کر سکے اور اس کی ضخامت طبع نازک پر بارِ گراں ثابت نہ ہو۔ اس سلسلہ میں جناب نوید عاجز صاحب کی تجویز کارگر ثابت ہوئی۔

خاکِ پائے صاحبدلاں

حافظ محمد اکرم راشد

کچھ مصنف کے بارے میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علی رسولہِ الکریم

قانونِ قدرت ہے کہ جب دنیا میں صدق وحقیقت پر خواہش اور نفس پرستی کے غبار اور پردے پڑ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے پیدا کرتا ہے جو صدق وسچائی اور حقیقت کو دنیا میں روشن کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی میرے تایا زاد حافظ محمد اکرم راشدؔ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے گونا گوں صفات سے نوازا ہے۔ عارف والا کے نواحی گاؤں 37 ای بی میں 1962 کے اوائل میں علمی خانوادے میں آنکھ کھولی والدِ محترم حافظ اللہ یار رحمۃ اللہ علیہ عالم باعمل تھے ابتدائی تعلیم اُن سے حاصل کی ۔ پانچ سال کی عمر میں والدِ محترم داغِ مفارقت دے گئے ۔اُس کے بعد حقیقی چچا میرے والدِ محترم حضرت علامہ حافظ شیر علی رحمتہ اللہ علیہ نے آغوشِ محبت میں لیا اور علم کی تکمیل تک ساتھ دیا ۔میٹرک کرنے کے بعد علمی پیاس بجھانے کے لئے کراچی گئے وہاں علم کی پیاس بجھاتے ہوئے علم کے سمندر بن گئے ۔ فاضل درسِ نظامی ، فاضل طب وجراحت ، فاضل عربی ، فاضل اردو کرنے کے بعد پنجاب گورنمنٹ میں بطورِ مدرس تعینات ہوئے ۔ دورانِ سروس ایم ۔اے ایجوکیشن ، ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی (گولڈ میڈلسٹ) پاس کیا۔

علمی زندگی میں روزنامہ ایکسپریس ، نوائے وقت میں مضامین لکھے اور عوام کی کثیر تعداد نے مضامین کو پسند کیا۔تاحال عارفوالا کے نواحی گاؤں میں ہیڈ مدرس ہیں اور عارفوالا شہر میں بطورِ خطیب خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ حافظ صاحب اپنے حلقہ احباب میں اپنی خوش اخلاقی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بہت مقبول ہیں ۔ اِن کی مذکورہ کتاب اُن کے علمی تبحّر کی گواہ ہے اللہ تعالیٰ اُن کی اِس کاوش کو قبول کرے اور مزید اس طرح کے گلدستے پیش کرنے کی سعادت نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ اُن کی عمر میں بھی برکت عطا فرمائے ۔آمین

گر قبول افتد زہے عزّ وشرف

خادم الفقرا

حکیم قاضی محمد اقبال اسدؔ

مضامین

عدل اجتماعی کا تصور و اہمیت

(تعلیمات نبوی کی روشنی میں)

عدل و انصاف فقط حشر پہ موقوف نہیں
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

اس کائنات رنگ و بو میں ہر سو عدل و انصاف کا نظام کارفرما ہے۔ کائنات کی ہر چیز نظام عدل کے گرد محو گردش ہے۔ ہر شعبہ زیست عدل و انصاف کے بغیر اپنا وجود قائم رکھنے سے قاصر ہے۔ اگر عدل و انصاف عنقاء ہو جائے تو کارخانہ حیات خزاں آشنا ہو جائے گا۔ فصلِ بہار کے عطر بیز جھونکے بھی اس کی عروق مردہ میں تازہ خون کی روانی کو برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ عدل سے مراد معنوی طور پر کسی شے کو اس کے درست مقام پر رکھنا ہے۔ شرعی اصطلاح میں عدل سے مراد لوگوں میں انصاف کرنا ہے، ان کے حقوق دلوانا، ظلم کا خاتمہ کرنا، عدل اسلامی تعلیمات میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ نیز عدل کے معنی ہیں ''افراط و تفریط سے بچنا'' یعنی کسی شے کا زیادہ ہونا نہ کم ہونا یہ درجہ مقام وسط یعنی درمیانی ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو دنیا میں جو بھی برائیاں ہیں وہ افراط و تفریط ہی کا نتیجہ ہیں۔ یعنی اجتماعی عدل کے قیام میں جو چیز سد سکندری ثابت ہوتی ہے وہ افراط و تفریط ہے۔ عدل اجتماعی جیسا کہ مفہوم سے ظاہر ہے کہ ایسا عدل جو سب کے لئے ہو، سب کا ہدف ہو، اور سب اس کے حصول کے خواہاں ہوں۔ نیز سب کیلئے ممدّ و معاون ثابت ہو یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ اجتماعی عدل کے حامی اسلام کے ہر سنہری دور میں موجود رہے ہیں۔

احادیثِ مبارکہ میں اسوۂ حسنہ سے عدل کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک عہد میں عدل کرنے میں کافر و مسلمان میں کوئی امتیاز نہ رکھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک یہودی اور مسلمان میں کسی بات پر تنازعہ ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دونوں کا مؤقف سنا اور پھر یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب قبیلہ بنو مخزوم کی عورت فاطمہ چوری کے جرم میں پکڑی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حد شرعی

جاری کرنے کا حکم دے دیا، لوگوں نے سفارش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سخت ناراض ہوئے اور تنبیہ فرمائی کہ تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوگئیں کہ اگر ان کا کوئی غریب جرم کرتا تو سزاوار ہوتا، اور اگر کوئی امیر بااثر جرم کرتا تو وہ چھوڑ دیا جاتا۔ خبردار! اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی اسی جرم میں پکڑی جاتی تو حدشرعی جاری ہوتی۔ اسلام نے جس شرح وبسط سے عدل وانصاف کے جملہ پہلوؤں کو متبیّن کیا ہے۔ دیگر مذاہب میں ایسی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اسلامی عقیدہ کی رُو سے سب سے بڑا عادل منصف خدائے وحدہٗ لاشریک ہے۔ چنانچہ اسمائے باری تعالیٰ میں اسم "عدل" بھی شامل ہے وہ اپنے عدل ہی سے کارخانہ عالم کو سنبھالے ہوئے ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (آل عمران، ۱۸)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، فرشتے اور اہل علم بھی شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ عدل وانصاف سے کارخانۂ عالم کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف زبانوں میں مختلف انبیاء کرام علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تو اُن کی بعثت کا ایک مقصد عدل وانصاف کا قیام بھی تھا۔ دنیا میں ظلم واستبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت کا درماں عدل وانصاف سے کرنا تھا۔ عدل وانصاف کے تریاق سے ظلم کے زہر ہلاہل کو نیست ونابود کرنا تھا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید، ۲۵)

ترجمہ:۔ بے شک ہم نے پیغمبروں کو کھلے معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے ان پر کتابیں اتاریں اور ترازو کو رواج دیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا تو اس عظیم کتاب کے نزول کا مقصد بھی عدل وانصاف قرار دیا۔ اس حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم دیتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (النساء، ۱۰۵)

ترجمہ:۔ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری تاکہ جیسا تم کو خدا نے سمجھایا ہے اس کے مطابق لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو اور دغابازوں کے حامی نہ ہو۔

انسان جوانسانیت کے منصب رفیعہ پر متمکن ہونے کے ساتھ ساتھ حلقہ بگوش اسلام بھی ہوتو اس کی حرکت اس کی نشست و برخاست، اس کے قیام وقعودسب کے سب رضائے الٰہی کے حصول کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ پوراوقت اس خواہش کی تکمیل کے لئے مختص کر دیتا ہے اور اسی میں اپنی کامیابی وکامرانی تصور کرتا ہے۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لئے مجاہد میں اسی لئے ہوں غازی

قرآن مجید جہاں دیگر شعبہ ہائے حیات میں انسان کی راہنمائی کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا وہاں رضائے الٰہی کے حصول کیلئے بھی عدل وانصاف کوانتہائی ناگزیر قرار دیتا ہے۔فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَقْسِطُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الحجرات،۹)

ترجمہ: اورانصاف کرو بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کودوست رکھتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، عدل کرنے والے اللہ کے پاس نور کے منبروں پر رحمٰن کے دائیں جانب بیٹھے ہوں گے، اور رحمٰن کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ (اعلیٰ مراتب پر ہوں گے) جولوگ اپنے گھر والوں اور جن پران کوحاکم بنایا گیا ہے۔ان میں عدل سے فیصلے کریں گے۔ (صحیح مسلم، ۱۸۲۷)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جب دنیا کی بقاء میں صرف ایک دن رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس دن کو طویل کر دے گا حتیٰ کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو بھیجے گا جس کا نام میرے نام کے موافق اور جس کے والد کا نام میرے والد کے نام موافق ہوگا۔ وُہ زمین میں عدل وانصاف کو بھر دے گا جس طرح زمین پہلے ظلم وناانصافی سے بھری ہوگی۔ (سنن ابی داؤد، ۴۲۸۲)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد مجھے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس لے کر گئے اور عرض کی کہ آپ گواہ ہوجائیں کہ میں نے نعمان کواتنی چیزیں ہبہ کر دی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا کہ کیا جتنی چیزیں تم نے نعمان کودی ہیں بقیہ بیٹوں کوبھی اتنی ہی چیزیں دی ہیں؟ اُس نے کہا کہ نہیں تو پھر آپ صلی

اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میرے سوا کسی اور کو گواہ بنالو۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہیں اس سے خوشی نہیں ہوگی کہ تمہارے بیٹے تمھارے ساتھ نیکی کرنے میں برابر ہوں؟ اس نے کہا کہ کیوں نہیں! پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہا کہ تم بھی ان کے ساتھ برابر کا سلوک کرو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ مجھے گواہ نہ بناؤ کیونکہ میں ظلم پر گواہی نہیں دیتا۔ (صحیح البخاری، ۲۶۵۰)

مندرجہ بالا آیات مبارکہ اور احادیث شریف سے عدل اجتماعی کی بابت وضاحت ہوتی ہے۔ اسی عظیم صفت سے متصف قضاۃ نے معرکۃ الاراء فیصلے سنائے اور معاشرے میں استبدادی قوتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں اہم کردار ادا کیا ایسے سپوتوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

اسلام نے اولین بار ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جو صراطِ مستقیم اور راہِ اعتدال پر گامزن رہا (اعتدال کے لفظ میں ہی لفظ عدل شامل ہے جو ایک قوم کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔) اس معاشرے کا ہر فرد نیکی کا گرویدہ اور بدی سے متنفر تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا فرضِ منصبی بنا کر اسلامی معاشرہ ''امت وسط'' کے لقب کا مستحق ہوا۔ دنیا میں اجتماعی عدل کو اسی طرح قائم کیا جاسکتا ہے کہ برائی کی جڑ کاٹ دی جائے اور شجر بر کو بار آور بنانے کے لئے جہدِ مسلسل کی جائے۔ اسی طرح دنیا کے نظام میں اعتدال پیدا ہوسکتا ہے اور دراصل یہی عدل اجتماعی ہے جس سے ہر مستحق عدل کو انصاف نصیب ہوتا ہے۔ اس سے ظلم وستم کے بادل چھٹتے ہیں عدل وانصاف کی بادِ نسیم اٹھکیلیاں کرتی ہے، ظلم کے عفریت کے جبڑوں سے اسے رستگاری ملتی ہے اور عدل کا پھریرا اس کے سر پر منڈلاتا ہے۔ عدل و انصاف کی فاختہ اس کے گھر کی منڈیر پر بیٹھتی ہے۔

ایک دفعہ پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک اعرابی سے کچھ قرض لیا اور ایک معینہ مدت تک واپس کرنے کا کہا مقررہ وقت پر جب وہ اعرابی آیا اور اپنے قرض کی واپسی کے لئے کہا تو اتفاقاً اس وقت قرض کی واپسی کا انتظام نہ ہوسکا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعرابی سے مزید مہلت طلب کی اور کہا کہ فی الوقت میں آپ کی مطلوبہ رقم واپس نہیں لوٹا سکتا چند ایّام کے بعد ایسا ہوسکے گا۔ یہ سن کر اعرابی کو طیش آگیا اور غیض وغضب کی حالت میں مغلظات بکنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اس وقت رسالت کے سائے میں تھے انھوں نے اس اعرابی

کو پکڑ لیا قریب تھا کہ وہ اس کو سزا دیتے لیکن حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منع کر دیا اور فرمایا کہ میں اس کا مقروض ہوں اور قرض لوٹانا میرا فرض ہے۔ اور یہ اس کا حق مجھ پر فرض ہے لہذا اس وقت بردباری اور صبر وتحمل کی ضرورت ہے۔ بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک صحابی سے قرض لے کر اس اعرابی کا قرض ادا کر دیا۔

اعرابی نے سوچا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے جم غفیر میں تھا۔ اگر وہ چاہتے تو میرا زجر وتوبیخ سے، مار پیٹ سے حلیہ بگاڑ دیتے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منع کرنے پر وہ اپنے عزائم کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ مجھے میرے رویے پر اظہار برہمی کرنا اُن کی آقائے نامدار کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ان کو رو کنا سراسر عدل وانصاف تھا، اس ماحول سے متاثر ہو کر اعرابی حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ عدل اجتماعی کی ایسی عظیم مثال شاذ ہی ملتی ہے کہ ایک غیر مسلم کے ساتھ عدل کیا جا رہا ہے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی پوری تعلیمات اس قسم کے واقعات سے مزیّن ہے۔

غزوہ خندق میں جب مدینے کے ایک جانب کھائی کھودنے کا فیصلہ ہوا تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے ساتھ ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم برابر کے شریک تھے۔ خندق کی کھدائی اور مٹی ہٹانے میں جس طرح دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم مصروفِ عمل تھے بالکل اسی طرح تاجِ نبوت کو اپنے سر سجانے والا بھی مصروف کار تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس تاثر کو ختم کرنے کیلئے پیہم جد و جہد کی کہ اسلام کی تعلیمات میں تشدّد اور امتیازی طرزِ عمل ہے۔ عدل اجتماعی یہی ہے کہ ایسے انصاف کا مظاہرہ کیا جائے جس سے دیگر تمام افراد مستفید ہوں۔ اس وقت اگر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خندق کی کھدائی میں شریک نہ ہوتے تو کوئی صحابی ٹس سے مس نہ ہوتا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تمام صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے جان تک قربان کرنے کیلئے ہمیشہ مستعد رہتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا یہ فعل آنے والی انسانیت کیلئے عدل وانصاف کی تاریخ رقم کر گیا۔

فتح مکہ کے موقع پر قریش کے ظالم سردار آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ اُن کے ذہن افسردہ ہیں۔ اُن کے قلب رنجیدہ ہیں۔ اجسام ہیبت نبوّت کے سامنے لرزہ براندام ہیں۔ انہیں آمنہ کے لعل کو، مدینے کے تاجدار کو، درّ یتیم کو، فخر المسلمین کو

دورانِ قیام مکہ پہنچائی گئیں ہمہ قسم تکلیفیں از بر ہیں، ظلم کے پہاڑ توڑے گئے پہاڑ رہ رہ کر یاد آرہے ہیں، اب قِصر کفر وشرک منہدم ہو چکا ہے۔ علم اسلام بلند ہو چکا ہے۔ سرداران قریش اس انتظار میں ہیں کہ ابھی آواز آئے گی کہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے، ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں، ان کے آرام وسکون کو برباد کر دیا جائے، اسی سراسیمگی کے عالم میں صدائے مُسرت نوید جانفزاء لے کر بلند ہوتی ہے کہ "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ" . آج کے دن تم پر کوئی پکڑ نہیں ہے۔ عام معافی کا اعلان ہو جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چاہتے تو ان سے ظلم کا بدلہ لے سکتے تھے لیکن شانِ رحمت العالمینی کے علمبردار نے معاف فرما دیا۔ اُن کے پہنچائے گئے زخموں پر کوئی اور فرمانروا ہوتا تو مرہم ظلم واستبداد کی صورت میں رکھتا اور اسی میں ہی اُس کی انا کی تسکین ہوتی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چونکہ سراپا رحمت اور مجسمہ عدل وانصاف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور چند لوگوں کے علاوہ کسی سے کوئی انتقام نہ لیا گیا۔ یہ عدل اجتماعی کی ایک عظیم مثال ہے جو خود پر کئے گئے مظالم کے بدلے میں معافی کا اعلان کر کے اُمّت کے سامنے پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ نہیں کیا کہ فلاں قبیلہ کو بخش دیا جائے اور فلاں کو عقوبت خانوں میں ڈال دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ظلم کے بدلے عدل وانصاف اور احسان کا مظاہرہ کیا۔ کرم خوردہ سماج کو عدل و انصاف کے حیات بخش خون سے زندگی بخشی اور شان عفوودرگزر کا منظر " الم نشرح" ہوا۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید فرقانِ حمید میں ارشاد فرمایا ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے تمہیں عدل اور احسان کا۔ قرآن پاک میں جو حکم آتا ہے وُہ سب کے لئے ہوتا ہے بشرطیکہ صاحب ایمان ہو۔ دینِ اسلام کی خلعت فاخرہ اُس نے زیب تن کی ہو، غیر مسلم مکلّف نہیں ہوتا۔ اب اگر کوئی شخص زرق برق لباس میں ملبوس ہو یا چیتھڑوں سے وہ صرف اپنے سَتر کو ڈھانپ سکتا ہو، چمنستان وگلستان کے پڑوس میں رہائش پذیر ہو، یا کسی ویرانے میں لگائی گئی جھونپڑی میں وحشت سے پریشان حال، میدان علم و دانش کا شاہسوار ہو یا بحر جہالت میں اُس کی ناؤ ٹامکٹوئیاں مار رہی ہو۔ آسمانِ علم ومعرفت کا

آفتاب و ماہتاب ہو یا حروفِ ابجد از ہر کرنے والا طفلِ مکتب، الغرض کوئی بھی ہو بشرطیکہ مسلمان ہوتو وہ اس بات کا پابند ہے کہ عدل و انصاف کا مظاہرہ کرے۔ یہ عدلِ اجتماعی کی لازوال مثال ہے۔مسلمان ہونے کے ناطے جس طرح دیگر عبادات کی پابندی لازمی ہے اس طرح عدل و انصاف سے معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنانے میں اہم کردار ادا کرنا بھی انتہائی ناگزیر ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ "ادخلوا فی السلم کافۃ" اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ۔ اگر کوئی صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے، زکوٰۃ کی بروقت ادائیگی اس کا پسندیدہ عمل ہے، حرمین شریفین کی زیارت کے لئے حج وعمرہ کی غرض سے سفر کا متمنی رہتا ہے، مساکین و یتامیٰ کے ساتھ حسنِ سلوک اُس کا طرہ امتیاز ہو، سخاوت کی صورت میں حاتم طائی کا ہم پلّہ ہو پھر بھی وُہ اسلام کے زیور سے اُس وقت تک مرصعّ ومزیّن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کے دل و دماغ میں، قلب ونظر میں، ادراک وشعور میں عدل وانصاف کی منوّر ومستنیر کرنیں جلوہ گر نہ ہوں۔عدل وانصاف کا تاج سر پر سجانے والا شخص معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتا ہے اور اس کے برعکس ظالم وجابر شخص ملک وقوم کے لئے ناسور ثابت ہوتا ہے۔

جملہ عبادات کا اگر بنظر غائر مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات مترشّح ہوجاتی ہے کہ ہر عبادت میں عدل شامل ہے۔عدل کی جامع تعریف جو سلف صالحین سے منقول ہے وہ یہی ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنا ہے، اُس سے سرمو انحراف عدل نہیں ہے۔ جملہ عبادات کی کماحقّہ ادائیگی بغیر عدل کے ناممکن ہے شرعی نقطۂ نظر سے ہی عدلِ اجتماعی کی ایک تابندہ مثال ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے دور پر اگر نظر دوڑائیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے اصحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین ستاروں کی مانند ہیں ان کی اقتداء کرو ہدایت پاجاؤ گے۔صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ ہے اور کسی مقام پر لوگوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ ہوتا ہے، اُس مقابلے میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیٹا بھی شریک تھا۔ اس مقابلے میں ایک عام شخص کا بیٹا جیت جاتا ہے اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے بیٹے کو شکست ہو جاتی ہے، مجدی اور سروری کا تصور صحابی کے بیٹے میں بدرجہ اتم موجود ہے، ہزیمت اور شکست نے اعصاب پر اعصاب شکن حملے کیے، دل و دماغ نے حقیقت کا اعتراف کرنے میں عجز کا اظہار کیا، تعصب کی عینک نے فاتح کی تصویر مکدّر دکھائی۔ دریں اثناء صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیٹے نے مقابلہ جیتنے والے کو تھپڑ رسید کر دیا۔ جب یہ خبر اُس لڑکے کے والد کو پہنچی تو اُس نے یہ تمام واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روبرو پیش کیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد عدل و انصاف میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طلب فرمایا اور ساری صورتحال سے آگاہ کیا کہ تمہارے بیٹے نے یہ زیادتی کی ہے اور شکست اُٹھانے کے بعد اُس فاتح لڑکے کو کہا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ میں معزز لوگوں کا بیٹا ہوں، پھر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُس کے بیٹے کو اور مظلوم فاتح کو آمنے سامنے کھڑا کرتے ہیں۔ اور فاتح کو فرماتے ہیں کہ معزز لوگوں کے بیٹے کو مارو! اور اس طرح فیصلہ کر کے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

عدل کا تقاضا بھی ہے کہ مجرموں کو ان کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے اسلام کی عدالت میں ان سے کوئی رعایت نہیں، ورنہ حکومت اور معاشرے کا نظام اپنے وجود کو قائم رکھنے میں قاصر رہے گا۔ اگرچہ مسلمان اجتماعی طور پر عدل کے پابند ہیں، یعنی معاشرے کا، قوم کا، ملک کا ہر فرد عدل کا پابند ہے، ہر ایک اپنی بساط کے مطابق عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے مستعد رہے۔ تاہم اسلامی ریاست اس سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ لازماً اس کو بھی عدل و انصاف کا پابند ہونا چاہیے۔ عدل و انصاف کی فراہمی اسلامی عدالت کا فرضِ اوّلین ہے۔ ہمیں اپنے اکابرین، سلف صالحین، اور برگزیدہ ہستیوں کے عمل سے یہی بات متبیّن ہوتی ہے کہ انہوں نے ہر زمانے میں عدل و انصاف کے دامن کو تھامے رکھا اور تمام معاملات میں عزت و عظمت نے اُن کا استقبال کیا۔ عدل کے بارے میں علمائے کرام کے اقوال:۔

☆ علامہ ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے مطابق فیصلہ کرنا عدل ہے نہ کہ محض اپنی رائے سے۔

☆ عبدالرّحمٰن بن ناصر الدین سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حقوق واجبہ کو خرچ کرنا اور مستحقین میں برابر حقوق تقسیم کرنا عدل ہے۔

☆ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نفس کے حقوق ادا کرنا اور اس سے دوسروں کے حقوق حاصل کرنا عدل ہے۔

☆ علامہ شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا افراط اور تفریط کے درمیان امر متوسط عدل ہے اور جو کام دین میں منع ہوں اُن سے بچتے ہوئے صراطِ مستقیم پر قائم رہنا عدل ہے۔

☆ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ عدل کا تصور واضح کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

بندہ کا حصہ عدل میں بالکل ظاہر ہے اس میں کوئی حق نہیں ہے عدل کے لیے اُس کے نفس کی صفات میں سے اُس کے لیے جو پہلی چیز واجب ہے وُہ یہ ہے کہ اُس کی شہوت اور اُس کا غضب اُس کی عقل اور اُس کے دین کے تابع ہوں کیونکہ اس نے اگر اپنی عقل کو اپنی شہوت اور غضب کے تابع کر دیا تو اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور عدل کے لیے دوسری چیز یہ واجب ہے کہ وہ تمام معاملات میں حدود شرع کی رعایت کرے اور ہر عضو میں اُس کا عدل یہ ہے کہ وہ اپنے ہر عضو کو شریعت کے اذن کے مطابق استعمال کرے اور اپنے اہل وعیال میں اس کا عدل یہ ہے کہ اُن کے جائز حقوق کو ادا کرے اور اگر وُہ حکومت کے کسی منصب پر فائز ہے تو اُس کا عدل یہ ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض کو دیانت داری سے ادا کرے۔

عدل وانصاف کی اہمیت اور فوائد:۔

(1) عدل کرنے والا دنیا اور آخرت میں مامون ہو جاتا ہے، دنیا میں تعریف وتحسین اور آخرت میں اجر وثواب کا مستحق گردانا جاتا ہے۔

(۲) عادل بادشاہ کی حکومت اور سلطنت کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور دشمن کے حملے کے وقت عوام اُس کی پشت پر ہوتے ہیں۔

(۳) عادل حکمران سے مخلوق راضی رہتی ہے اور اُن کی رضا کی وجہ سے ان سے اللہ بھی راضی رہتا ہے۔

(۴) عدل وانصاف کرنے والا پہلے اپنے اعضاء کے ساتھ عدل کرتا ہے اور ان کو گناہوں سے بچاتا ہے اور اپنے اہل وعیال سے عدل کرتا ہے اور ان کو برائیوں سے اجتناب کرنے کی تلقین کرتا ہے اور نیکی کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور پھر عام مسلمانوں اور معاشرے میں نیکی کا حکم دیتا ہے۔

(۵) عدل اور انصاف سوشلزم، کمیونزم اور کیپلزم کا راستہ روکتا ہے اور اسلامی نظام معیشت کی راہ ہموار کرتا ہے۔

(۶) عدل وانصاف سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنّت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کی اتباع حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔

(۷) عدل اور انصاف لوگوں کے حقوق اور انکی امانتوں کی حفاظت کا ضامن ہے اور اس سے معاشرہ بے چینی، خلفشاری اور انارکی سے محفوظ رہتا ہے۔

(۸) عدل وانصاف قائم کرنا لا الٰہ الا اللہ کی شہادت میں اخلاص کی علامت ہے۔

(۹) عدل وانصاف کرنے والے کو قیامت کے دن نور کا لباس پہنایا جائے گا۔

(۱۰) عدل وانصاف کرنے والا قیامت کے دن اللہ کی لعنت سے، فرشتوں کی لعنت سے اور لوگوں کی لعنت سے محفوظ رہے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا:

''جس نے مجھ سے کوئی بدلہ لینا ہے لے لے میں حاضر ہوں!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے آپ کو بھی قصاص کے لیے پیش کر کے واضح فرمادیا کہ بحیثیت بشر نبی کی ذات بھی قوانین شرعیہ سے بالاتر نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ مثال قائم کر کے اُمّت مسلمہ کے لیے راہ عمل کا تعیّن کر دیا۔ وُہ ہستی جس کے بارے میں ہے کہ ''بعد از خدائے بزرگ توئی قصہ مختصر'' کی صدائیں منبر ومحراب میں بلند ہوئیں، جن کے توسل سے دعائیں اجابت کا جامہ زیب تن کرتی ہیں۔ جن کے نقش قدم پر چلنا باعثِ رحمت ونجات ہے۔ جن کی حیات طیّبہ ہمارے لیے نمونہ کامل ہے۔ وُہ اگر اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تو ماوشما کس گنتی میں ہیں۔

آج ہم میں سے اگر کوئی دنیاوی عہدے پر فائز ہو، اور اس فانی زندگی پر ترجیح دیتا ہو، اُس کی نظر میں عارضی زندگی کی چمک دمک اُخروی زندگی کی ابدی خوشی سے کہیں بالاتر ہو اور وہ اپنے آپ کو قانون سے مستثنیٰ گردانتا ہو تو پھر اس کی عقل پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔ اُس کا یہ فعل قابل نفریں تو ہوسکتا ہے لیکن قابل تحسین ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وُہ ہستی جس کی اطاعت کو، جس کی

فرمانبرداری کو، جس کی اتباع کو خالقِ کائنات خود اپنی اطاعت کہے اور وہ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہ سمجھے اور وقتِ وفات علی الاعلان کہہ دے کہ جس کسی نے بدلہ لینا ہے لے تو پھر عام شخص کیسے مستثنیٰ ہوسکتا ہے۔ قانون کی پابندی ہر کس و ناکس کے لیے لازمی ہے۔

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں عدل کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ ایک مثالی معاشرہ کے قیام کے لیے عدل وانصاف انتہائی ناگزیر ہے۔

لین دین، معاملات، ملازمتیں، باہمی تعلقات کے تمام پہلوؤں میں عدل وانصاف کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے فرار ناممکن ہے۔ ہر معاملہ میں توازن لازمی ہے جہاں اس کی کمی ہوگی وہاں حقوق تلف ہوں گے، خون خرابہ ہوگا حسن مجوب ہوگا، خلفشاری ہوگی، بدامنی ہوگی، انارکی ہوگی، کساد بازاری ہوگی، زندگی بے بندگی شرمندگی میں بدل کر رہ جائے گی۔ انسانوں کی برادری کے قیام کا انحصار عدل پر ہے، اقوام اور قبائل کے تعلقات کا دارومدار عدل وانصاف پر ہے۔ عدالتی فیصلوں پر عملدرآمد کرانا بہت ضروری ہے، کیونکہ اس سے امن قائم ہوتا ہے۔ جہاں کسی عدالتی عمل میں بگاڑ پیدا ہوا وہاں نقص امن نے بھیانک شکل اختیار کر لی۔ عدالتوں کا قیام اس لیے ہوتا ہے کہ وہ عوام النّاس کے درمیان عدل قائم کریں۔ ظالم سے مظلوم کا حق دلوائیں، ظلم واستبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت کے زخموں پر مرہم لگائیں۔ بلاتفریق عدل وانصاف کا بول بالا کریں، اور اپنے رستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کا سدباب کریں۔

عدالتی فیصلوں پر عملدرآمد کروانے کے لیے ریاست کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عدالت کے ساتھ تعاون کریں۔ قانون سے کوئی ماوراء نہیں ہوتا۔ ہماری تاریخ کے اوراق اس قسم کے فیصلوں سے بھرے پڑے ہیں کہ حکمرانوں نے خود اپنے آپ کو کٹہرے میں پیش کیا، جب دل ودماغ میں یہ فتور پیدا ہو جائے کہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں، میرا سلسلہ نسب دیگر لوگوں سے ارفع ہے، میں قانون کی گرفت سے بالاتر ہوں تو پھر عدالتی نظام تعطل کا شکار ہو جاتا ہے اور جملہ اراکینِ عدالت بددلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اُن کے فیصلہ کرنے کی جو قوت ہے وُہ بھی متاثر ہوتی ہے۔

ملک وقوم اور معاشرہ اس اندھے قانون میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایسا قانون جو چھوٹے، بڑے امیر وغریب، آجر واجیر میں فرق روا رکھے وُہ ایک عظیم عدلیہ کے قیام

کا باعث نہیں بن سکتا۔

دور نبوی ہو، خلفائے راشدین ہوں، دور بنوامیہ ہو، دور بنوعباس ہو جتنے ادوار بھی گزرے ہیں سب میں قانونِ الٰہی کی حکمرانی رہی ہے۔ خدائی قانون سب کے لیے ایک ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ اگر کوئی بزعم خویش کسی اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتا ہے اور وہ اسلامی قوانین کی دھجیاں اڑاتا ہے، اسلامی شعار کی بے حرمتی کرتا ہے تو اس کے لیے جو عذابِ آخرت مقرر ہے وُہ ضرور اُس کا سزاوار ٹھہرے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی سیدھا سادا مسلمان ہے، ایک عام گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، سادا مگر پاک لباس زیب تن کرتا ہے اور احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں کوئی پس وپیش نہیں کرتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہے تو اس وجہ سے آخرت کے انعامات سے محروم نہیں رکھا جائے گا کہ وہ ایک عظیم گھرانے سے تعلق نہیں رکھتا ہے یا اس کی نسبت کمزور ہے، اس کو وہ تمام انعامات جس کا وعدہ کیا ہے ضرور ملیں گے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے کہ ''اے لوگو بیشک ہم نے تمہیں عورت اور مرد سے پیدا کیا اور قومیں اور قبائل بنائے تا کہ تمہاری پہچان ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل وہ ہے جو پرہیز گار ہے یعنی فضیلت کا دارومدار تقوی پر ہے نا کہ کسی مال ومنفعت پر یا کسی رنگ نسل پر جو پرہیز گار ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت والا ہے اور جو پرہیز گار نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت والا نہیں ہے۔'' دنیا میں اس کا ایک مقام ممکن ہے، دنیا میں اس کی آؤ بھگت کی جاسکتی ہے، اس فانی زندگی کے ایّام وہ اچھے گزار سکتا ہے، اس عارضی زندگی کے شب وروز رنگین بنا سکتا ہے لیکن حقیقی زندگی اور ابدی زندگی میں آسائش وآلام مفقود ہے۔ اپنے حقیقی مالک، خالق اور رازق جس کی رضا ہر مسلمان کا مقصدِ حیات ہونی چاہیے اس سے وہ کوسوں دور ہے اور یہی اس کی ناکامی ہے اور اس کے خائب وخاسر ہونے کا سبب عدم تقویٰ ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی نظر میں اعلی مقام حاصل کرلے، اور مناسب رفیعہ پر متمکن ہوجائے تو اس کو تقویٰ اختیار کرنا ہوگا اور اس کو درِ عدالت پر دستک دینا ہوگی کیونکہ یہی اس کی منزل کے قریب کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" عدل کرو تقوی کے زیادہ قریب ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر انسان اُس امر کا خواہاں ہے جس میں اس کی منفعت زیادہ ہو، اس

کے مفاد میں ہو۔ مندرجہ بالا آیت کریمہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے، اور یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ انصاف کرو یہ تمہیں تقویٰ کی معراج پر پہنچادے گا۔ اور تمھیں اُخروی زندگی میں کامیابی مل جائے گی۔

عدل وانصاف کا شجر سایہ دار اُس وقت بار آور ثابت ہوگا جب ہم ہر شعبے میں عدل وانصاف کے بیج بوئیں گے۔ کیونکہ عدل ہر شعبے میں ہوگا تو پھر ہی اس کے اثرات مرتب ہوں گے اور پھر ہی یہ عمل اجتماعی ہوگا اور اگر یہ صرف کسی ایک شعبہ میں ہو اور دیگر شعبہ جات اس وجود سے خالی ہوں تو ایسا عدل انفرادی تو کہلا سکتا ہے عدلِ اجتماعی ہرگز نہیں۔

تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں اگر ہم دیکھیں تو عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر اب تک جہاں بھی اسلام کے پیروکار موجود ہیں وہاں زندگی کے تمام شعبوں میں عدل وانصاف کا نور نظر آتا ہے اگر کسی پہلو کی کوکھ عدل سے خالی ہو تو وہاں خلفشاری اور بے چینی تو ہوگی سکون واطمینان محال ہے۔

عدل کا جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک چیز کو اس کا اصل مقام دینا، برابری مساوات، اور یکسانیت اس میں داخل ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے شعبے میں عدل کا پابند ہے اور پھر یہ مل کر ایک اجتماعی شکل اختیار کر جاتا ہے، جس سے معاشرے کے معاشی اور سیاسی تمام شعبے اس کی پُرنور کرنوں سے منور ومستنیر ہو جاتے ہیں اور ایک عظیم معاشرے کی تشکیل ہو جاتی ہے۔

ایک خطیب اگر محراب ومنبر کے تقدس کا خیال رکھتے ہوئے دورانِ خطابت عدل وانصاف کا مظاہرہ کرے گا تو اس کا سامعین پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ خطیب اور واعظ کا عدل یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق اپنی وعظ ونصیحت کے مضمون کو مرتب کرے۔ فرقہ واریت اور مسلکی آگ کو ہوا نہ دیں۔ اسی طرح اُس کا وعظ جہاں پر تاثیر ہوگا وہاں اُس کے دُوررس نتائج برآمد ہوں گے۔

ایک جج اور منصف جس کا منصب یہی انصاف کرنا ہے وہ بھی صرف اسی صورت میں کامیاب عادل اور منصف ہوسکتا ہے کہ اس کے مطالعہ کی میز رشوت، اقربا پروری تعصب اور خودغرضی کی گرد سے پاک اور صاف ہو اور اس کا ذہن ریاست میں استحکام بخشنے کا آرزومند ہو اور اس کے جذبات حبُ الوطنی سے معمور ہوں۔

سیاستدان اگر خدمت خلق کا جذبہ لے کر آئے گا، اسمبلیوں کی نشستوں کی زینت بنے گا تو وہ بھی صرف اس صورت میں کامرانی کے گلستان وچمنستان میں گل چینی کرسکتا ہے جب اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون عدل وانصاف کے حیات بخش قطروں کی صورت میں محوگردش ہو۔ اگر وہ عدل و

انصاف کے زیور سے مزیّن ہوگا تو راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کا خاتمہ اس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔اور حقوق العباد کی پاسداری میں اسمبلی میں اٹھنے والی اس کی آواز ایوانوں کو ہلا کر رکھ دے گی۔ظلم وستم کی گھنگھور گھٹائیں چھٹ جائیں گی۔اور عدل وانصاف کا آفتاب نمودار ہوجائے گا۔

انسان اگر اپنے اعضاء سے عدل کرے جس مقصد کے لیے وہ بنائے گئے ہیں اسی مقصد کے لیے استعمال کرے تو وہ تندرست وتوانا رہیں گے اور اپنے ہدف کے حصول میں مستعد رہیں گے، اگر وہ غلط استعمال ہوں گے تو ان میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا اور توازن برقرار نہ رکھ سکیں گے۔کسان کا عدل یہ ہے کہ وہ اپنے کھیت وکھلیان کو سرسبز وشاداب بنانے کے لیے شب وروز کاوش کرے، بیج بونے سے لے کر فصل کی کاشت تک انتھک محنت کرے اور پھر اس کی یہ کوشش رنگ لائے گی اور فصل میں خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔اور اس کے کھیت و کھلیان اس کی دن رات کی محنت سے کشتِ زعفران کا نمونہ پیش کریں گے اور اگر اس نے اپنی اس فصل کے ساتھ عدل نہ کیا تو پھر نفع بخش چیز کے علاوہ خس و خاشاک ہی اُگیں گے جو منفعت سے خالی ہوں گے۔

شعبہ تدریس میں عدل کی ایک صورت اس طرح مترشّح ہوتی ہے کہ معلم اور متعلم دونوں عدل وانصاف کے تقاضے پورے کریں گے۔متعلم کے لیے یہ عدل ہے کہ وہ ہمہ تن گوش ہوکر تعلیم حاصل کرے اور اپنا پورا وقت اور مکمل توجہ اس کی طرف گامزن رکھے۔اور معلم کے لیے یہ عدل ہے کہ وہ اپنی تدریس کو کامیاب بنائے۔سبق کو پڑھانے سے پہلے اس کا مطالعہ کر کے آئے، طلباء کی روحانی تربیت کرے، پورا وقت تدریس پر صرف کرے، طلباء کی ہر لحاظ سے تربیت کرے۔اگر یہ دونوں معلم اور متعلم اپنی ذات کے ساتھ عدل نہیں کریں گے تو معلم کی دی ہوئی تعلیم اور متعلم کے پڑھے ہوئے اسباق معاشرے میں قوم میں اور ملک میں کوئی اہم کردار ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔نتیجتاً ظلم وستم، جبر واستبداد کے مہیب سائے ملک کے تعلیمی اداروں اور جامعات کو اپنی گرفت میں لے لیں گے اور تعلیمی ہدف بھی پورا نہ ہوسکے گا۔

طبی شعبہ کی طرف جاتے ہیں تو اُس میں بھی کامیابی اسی صورت میں متبیّن ہوتی نظر آتی ہے کہ مسیحا اپنے پیشہ سے وفا کرے، طبیب اپنے شعبہ سے مخلص ہو، اور یہ اخلاص اس صورت میں پیدا ہوسکتا ہے کہ طبیب مساوات اور عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔اگر وہ عادل

طبیب ہے تو وہ اپنے پیشے سے وفا کر رہا ہے اس کے برعکس ہے تو وہ حقیقتاً مسیحائی کی عظیم صفت سے متّصف نہ ہے۔ کسی مریض کو وہ کافی دیر تک چیک کرے اور اس کو مفید اور متمتع مشوروں سے نوازتا رہے، اور کسی کے لیے صرف نبض پر ہاتھ رکھنے کا وقت ہو تو یہ عدل نہیں بلکہ ظلم ہے، جو ایک کامیاب طبیب بننے میں سدِ سکندری ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ ایک مسیحا کے لیے مناسب نہ ہے کہ وہ امیر و غریب، اور چھوٹے بڑے میں دورانِ تشخیص فرق روا رکھے۔ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ہی وہ اپنے پیشہ سے مخلص رہ سکتا ہے۔

الغرض زندگی کے جملہ تمام شعبوں میں اگر عدل و انصاف کی بادِ نسیم نہ پہنچی تو پھر وہ ظلم و استبداد کے عفریت کے خونخوار جبڑوں سے کبھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اور بحیثیت مسلمان اگر ہم نے عدل و انصاف کا دامن نہ تھاما تو پھر ہم نام کے مسلمان ہوں گے، حقیقی اسلام کے روح پرور مناظر سے ہماری آنکھوں کو بھی ٹھنڈک نصیب نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ عدل اسلامی احکامات کا ایک جزو لاینفک ہے اور مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اسلام میں ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ'' کے مصداق اسلام میں پورا پورا داخل نہ ہو جائے۔ اجتماعی عدل ہی کامیابی و کامرانی کی قصر رفیعہ پر متمکن ہونے کا باعث بنتا ہے۔ لیکن آج ہم اس عظیم صفت سے محروم ہیں اور دیارِ غیر کی آب و ہوا کے مسموم جھونکوں نے ہماری خودداری، عزتِ نفس، اولوالعزمی، مساوات اور عدل و انصاف جیسی عظیم خصوصیات کو یکسر ختم کر دیا ہے۔ ہمارے سلف صالحین اِن خصائل حمیدہ سے مرصّع و مزیّن تھے اور ان کو دیکھ کر کفر و شرک کے در و دیوار لرزہ بر اندام ہو جایا کرتے تھے۔

مثال ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

اسلام نے عدل و انصاف کے عمل کو پورا کرنے کے لیے اصولِ اساس وضع کیے ہیں۔ جو کچھ یوں ہیں

(۱) مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو عدالت میں یکساں سمجھا جائے فیصلہ اس وقت ہو جب سماعت مکمل ہو جائے۔

(۲) فیصلہ ظاہری بیانات اور دلائل پر ہو کیونکہ قانون لوگوں کی نیابت اور دلی ارادوں

پر مواخذہ نہیں کرتا۔فرمان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:۔

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ظاہر کو دیکھ کر فیصلہ کروں'' اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلی بھید جانتا ہے۔

(۳) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو نصیحت فرمائی کہ کوئی فیصلہ اس وقت تک نہ کرنا جب تک فریقین کا مقدمہ مکمل نہ سن لو۔

(۴) عدالت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ شہادت وثبوت مہیا کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے، عدمِ شہادت کی صورت میں مدعا علیہ سے بے گناہی کی قسم لی جاتی ہے۔''البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر''

(۵) عدالتی کاروائی میں قاضی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس لیے فریقین میں سے کسی کی رعایت کرنے کا حکم نہیں ہے اس کا جھکاؤ اگر کسی طرف ہو تو اس سے انصاف کی توقع عبث ہے۔

یہ تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نتیجہ تھا کہ عرب کے بدّو راہبر اور رہنما بن گئے اور عرب کے صحراؤں میں بہار آ گئی اور دنیا کے اندر اسلام کے جھنڈے لہرانے لگے کفر وشرک کے در ودیوار میں زلزلہ آ گیا اور عدل وانصاف کے ہر سو چرچے ہونے لگے۔

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا
خاک کے ذرّوں کو ہمدوش ثریا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

آج اگر ہم تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے عدل وانصاف کا دامن تھام لیں اور زندگی کے جملہ شعبوں میں اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارے جملہ امور بحسن و خوبی انجام پانے لگیں گے۔اور دیگر اقوام سے ہم کسی صورت بھی پیچھے نہ رہیں گے۔جو عدل اجتماعی دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھا، دور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں تھا، خلفائے راشدین رحمۃ اللہ علیہ میں تھا، دور تابعین میں تھا، دور آئمہ مجتہدین میں تھا، دور سلف صالحین میں تھا، آج ہمارے حیات کے جملہ پہلوؤں کا جز و لاینفک بن جائے تو ہماری ترقی وعروج کی تمام راہیں وا ہو جائیں گی۔المختصر ہماری بقاء کا راز تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں عدل وانصاف کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے میں مضمر ہے۔

کٹتا ہے ظالم کا سر تو عدل کی شمشیر سے
ہے بقا مظلوم کی انصاف کی زنجیر سے

احترام آدمیت

اس کائناتِ رنگ و بو میں ہر چیز اپنی شناخت اور پہچان رکھتی ہے، اپنے وجود کے اظہار کے لیے اس کی کوئی نہ کوئی شناخت ہے سورج کی شناخت یہ ہے کہ وہ مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے، ستاروں کی شناخت یہ ہے کہ وہ رات کو آسمان پر درخشاں ہوتے ہیں۔ پہاڑوں کی شناخت اور پہچان یہ ہے کہ دور سے دکھائی دیتے ہیں اور بلند و بالا ہوتے ہیں۔اسی طرح پھول کی پہچان ہے کہ وہ خوشبو فراہم کرتا ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول کو معطر اور خوشبودار رکھتا ہے۔اسی طرح مسلمان کی بھی ایک پہچان ہے وہ یہ کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے دیگر مسلمان محفوظ رہتے ہیں۔ وہ کسی کو گزند نہیں پہنچاتا کسی کو تکلیف پہنچانا اس کو ناگوار گزرتا ہے۔کسی کی پریشانی وہ اپنی پریشانی سمجھتا ہے۔تو بس اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ آدمی اور انسان کا احترام کیا جائے اور اس کے حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے۔قرآنِ پاک میں بھی انسان کے ساتھ حسنِ سلوک اور رواداری کی تلقین آئی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''لوگوں کے ساتھ احسن طریقے سے گفتگو کریں، حسن سلوک سے پیش آئیں''

اسلام کی جملہ تعلیمات احترامِ آدمیت کی تلقین کرتی ہیں نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کو ہم دن میں پانچ مرتبہ ادا کرتے ہیں۔اور اس میں بھی حکم ہے کہ جب مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے کوئی آئے خواہ وُہ لباس فاخرہ میں ملبوس ہو، خواہ وہ صاف مگر سادہ لباس زیب تن کئے ہوئے ہو۔خواہ اس کا قد بڑا ہو، دبلا پتلا ہو یا لحیم شحیم ہو وہاں سب برابر ہیں۔اور ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے امیر و غریب اور سرخ سفید کا فرق مٹ جائے گا اسلام تو احترام آدمی کا درس دیتا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز !
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

والدین کا ذکر آتا ہے تو حکم ہوتا ہے کہ والدین کا احترام کرو اور ان کے ساتھ بھلائی کے

ساتھ پیش آؤ ان میں سے دونوں یا ایک عمر رسیدہ ہو جائے تو کسی کو بھی اُف تک نہ کہو۔ یہ آدمیّت کے احترام کی ایک بہترین صورت ہے۔اس طرح مختلف احادیث پاک سے یہ بات ثابت ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ہمیشہ سلامتی کا طلبگار رہے اور سلامتی ہمیشہ اس کی طلب کی جاتی ہے جس کے ساتھ محبت ہو، پیار ہو، جس کا احترام دل کے اندر ہو حکم ربّانی ہے کہ تم آپس میں جب ملاقات کرو تو ایک دوسرے پر سلام بھیجو اور کہو السلام علیکم اور دوسرا جواب میں کہے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ اور پھر احترام آدمیت کی یہاں تک انتہاء کر دی کہ فرمایا ایک مرتبہ نہیں اگر وُہ دونوں مسلمان دن میں بیس مرتبہ بھی آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کو آپس میں سلام کریں اور پھر بات یہاں تک نہیں رہی بلکہ فرمایا کہ مرنے کے بعد تم میں سے جب کوئی قبرستان جائے تو ان پر لازم ہے کہ وہ وہاں جا کر کہے السلام علیکم یا اھل القبور ''اے قبر والو! تم پر سلامتی ہو۔''

اسلام ادب واحترام کا درس دیتا ہے۔ بڑے کے لیے ضروری ہے کہ وہ چھوٹے پر شفقت کرے، چھوٹے کے لیے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ وہ بڑے کا احترام کرے، اس کے آگے نہ چلے، یہ احترام آدمیت نہیں تو اور کیا ہے۔ طالب علم اپنے اُستاد کا احترام کرتا ہے۔ مرید اپنے مرشد کا احترام کرتا ہے۔ چھوٹا اپنے بڑے کا احترام کرتا ہے۔ یعنی احترام کا سلسلہ جاری رہتا ہے حدیث پاک میں آتا ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور ایک دوسرے کو اس طرح مضبوط کرتا ہے جس طرح ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے۔ اور مسلمان ہمیشہ اپنے بھائی کی موجودگی میں یا غیر موجودگی میں بھلائی ہی سوچتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک اور مقام پر ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے کعبہ میں پھنس جائے اور نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو تو کعبہ جیسی مقدس عمارت جس کے طواف کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا نام آتا ہے۔ جس سے محبت عالم اسلام کا ذرہ ذرہ کرتا ہے فرمایا اس کی دیوار توڑ دو اور اس میں پھنسے ہوئے شخص کو نکال لیں۔ آج ہم آئے دن جو پستی کی طرف جا رہے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ حسد، بغض اور نفرت ہی کی بدولت ہے، ہمارے سلف صالحین نے بھی ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اگر دینی اور دنیاوی طور پر سرخ رو ہونا ہے تو احترام آدمیّت کا خوگر ہونا پڑے گا۔ تعاون، معاونت، مساعدت کو اپنا شعار بنانا پڑے گا۔ یہ وقت کا تقاضا بھی ہے اور جملہ اسلامی عبادات کی منشا بھی!

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر

خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

☆☆☆☆☆☆☆☆

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''

آج سے چودہ سو سال پہلے کائنات گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں مستور تھی۔ ہر طرف جبر و تشدد کی ژالہ باریاں مصروفِ تباہی تھیں۔ درندگی و بہیمیت کی سموم فضاء میں حق پرستی اور پرہیز گاری ناپید ہو چکی تھی۔ صنفِ نازک کی عصمت کا کوئی محافظ نہ تھا۔ ہر طرف آلام و مصائب کے بگولے محوِ رقص تھے۔ صبح و شام غرباء فقراء کے سروں پر ظلم و تعدّی کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ جہاں تک نظر پڑتی کشت و خون، درندگی و حیوانیت اور خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔ انسانی عقائد ضعف و اضمحلال کا شکار ہو چکے تھے۔ گویا کفر و ضلالت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا طوفان تھا جس کے تند و تیز تھپیڑوں میں انسانیت کی شکستہ ناؤ ہچکولے کھا رہی تھی۔ بلائے عظیم میں گرفتہ کسی نجات دہندہ کے منتظر تھے۔

بالآخر خالق کائنات کو سسکتی ہوئی انسانیت پر رحم آیا۔ رَبِّ کعبہ نے رشد و ہدایت کے اس آفتاب کو افقِ فاران پر طلوع کیا۔ وہ آفتابِ صداقت جو ختم المرسلین ہے جو رحمتہ العالمین ہے، شافع المذنبین ہے، اسلام جس کا دین ہے۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آئے، کائنات میں انقلاب آ گیا۔ یاس و قنوطیت سے پژمردہ چہروں پر اُمید کی بہار آ گئی۔ قتل و غارت اور خوف و ہراس کی آندھیاں تھم گئیں۔ صنم خانے تراشیدہ ریزہ ریزہ ہو گئے۔

عرب و عجم کے ایوان ہائے عیش و طرب منہدم ہونے لگے۔ وادی خزاں میں گل ہائے رنگا رنگ کے لیے صدق و صفا اور عدل و انصاف نے جنم لیا۔ بندہ و صاحب محتاج و غنی کا امتیاز مٹ گیا دانائے رسالت کی ضیاد پاشیوں سے گمراہی و ضلالت کی سیاہی دُھل گئی۔ رسولِ ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قلب و نظر کو شرک و کفر کے خس و خاشاک سے مبّرا و منزّہ کر کے توحید و رسالت کا گہوارہ بنایا۔ (ماخوذ)

وُہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیءِ سینا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قیادت میں ریگستانِ عرب کے بد وصفحۂ ہستی پر چھا گئے۔ بحرِ رسالت میں غواصّی کر کے عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنتے ہیں تو کہیں عمر کی وفا شعاریاں انہیں فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنا دیتی ہیں۔ درسِ رسالت میں کوئی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنتا ہے تو کوئی حیدرِ کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا
خاک کے ذرّوں کو ہمدوش ثریا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ کا گوشہ گوشہ فکر عمل کا لمحہ لمحہ، کتاب زیست کی ہر سطر آفتاب و ماہتاب سے تابندہ تر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کے روز و شب اور قول و فعل کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے باعث نجات ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: **لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنه**

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

خیر الامم کی سیرت و کردار ایک کھلی کتاب ہے ہر شخص اس کا مطالعہ کر کے اپنے قلب کو منور کر سکتا ہے۔ کوئی تاجور ہو یا سخنور، امیر ہو یا فقیر، خطیب ہو یا طبیب، ماہی گیر ہو یا عالمگیر سب کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت مشعلِ راہ ہے۔ دوستو اُمراء خطّہ عرب کے خزانوں کا والی دیکھیں، غرباء شعبِ ابی طالب اور ہجرت مدینہ کو دیکھیں، سپہ سالار غزوات بدر و حنین کا مطالعہ کریں۔ فاتحین فتح مکہ کا نظارہ کریں تو راہ پا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں کوئی انسان کامل نہیں۔ کسی کی زندگی اتنی ہمہ صفت اور ہمہ گیر نہیں جتنی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی۔ دنیا کے بڑے بڑے سلاطین، دانشور، اطباء، علماء اور فلسفہ دان اور ماہرین نفسیات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

تاجداریِ کونین کی نگاہ ناز سے اعلیٰ وادنیٰ قلب ونظر، ذکر وفکر اور عقل وعشق یکساں فیضیاب ہوتے ہیں۔

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل غیاب و جستجو! عشق، حضور واضطراب

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتیں

پیار کا لفظ جب کسی جانب سے سنائی دیتا ہے تو گلستان محبت میں عشق ومستی کے گلہائے رنگارنگ کھلنا شروع ہوجاتے ہیں اور بادِ بہار نکہت بکھیرتی ہوئی اٹھکیلیاں کرتے ہوئے چلنا شروع ہوجاتی ہے۔ دل کی دنیا بدلنا شروع ہوجاتی ہے، ماحول میں تازگی آجاتی ہے۔ جس طرح یرقان کے مریض کو ہر چیز زرد نظر آتی ہے اسی طرح پیار ومحبت کے متوالے کو ہر سو پیار ہی پیار نظر آتا ہے اور اس کے اندر کے موسم میں ہمیشہ بہار رہتی ہے۔ خزاں نا آشنا باطن کا حامل ہوتا ہے۔

جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے

اس عالم رنگ وبو میں کئی ایسی شخصیات منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں جو صفت جامعیت سے متصف نہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو ان کو کامل اور اکمل بنا کر بھیجا۔ ان میں آدم علیہ السلام کا خلق، شیث علیہ السلام کی معرفت، نوح علیہ السلام کی شجاعت، ابراہیم علیہ السلام کی دوستی، اسحاق علیہ السلام کی رضا، لوط علیہ السلام کی حکمت، ایوب علیہ السلام کا صبر، یونس علیہ السلام کی اطاعت، یوشع علیہ السلام کا جہاد، داؤد کی آواز، دانیال علیہ السلام کی محبت، الیاس علیہ السلام کی پاک دامنی، جیسی صفات ودیعت فرمائیں۔ لیکن جتنی صفات دیگر انبیاء کرام علیہ السلام میں فرداً فرداً موجود ہیں وہ جملہ صفات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذات والا صفات میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

حُسنِ یوسف ، دمِ عیسیٰ ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضرت ہند جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پہلے شوہر تھے فرماتے ہیں کہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طبیعت میں نرمی تھی، سخت مزاج نہ تھے کسی کا دل نہ دکھاتے تھے، کسی کی عزت کے خلاف کوئی بات نہ کہتے تھے، کھانا جیسے سامنے آجاتا کھا لیتے، اس کو برا نہ کہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے ذاتی معاملہ میں بھی غصہ نہ آتا تھا، نہ کسی سے انتقام اور بدلہ لیتے تھے اور نہ کسی کی دل شکنی گوارا کرتے۔ ہر ایک پر پیار و محبت کے پھول نچھاور کرتے تھے۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیاری باتیں مسلمانوں نے بڑھ بڑھ کر بیان کیں۔ اس لیے کہ ان کا تو دین و ایمان بھی سرکار علیہ السلام کی عقیدت و غلامی ہے۔ دشمنوں کے کیمپ میں جھانک کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں نے، سکھوں نے، عیسائیوں نے برہمو نے، سادھوؤں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتیں لکھی ہیں۔ یورپ جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ کوئی عقیدت نہیں، وہاں بھی مشتری کی خدمت کے لیے، پالمی ذوق یا تاریخ عالم کی تکمیل کے لیے لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے دمشق کے ایک علمی رسالہ ''مقتبس'' میں شمار اچھپا تھا کہ اس وقت تک یورپ کی مختلف زبانوں میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق تیرہ سو کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیاری باتوں کا ذکر کریں یا ان کو ضبطِ تحریر میں لائیں تو اس کے لیے بڑا وقت درکار ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ اگر زمین پر جاری دریا و سمندر سب سیاہی بن جائیں اور تمام درختوں کی قلمیں بنائی جائیں تو دریا ختم ہو سکتے ہیں قلمیں ٹوٹ سکتی ہیں لیکن پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیاری باتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔

گُماں مبر کہ مضمون نہ ماندہ است
ہزار سال تواں سخن بزُلف یار گفت

☆☆☆☆☆☆☆

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ایک باوقار، خودمختار، ذی شعور اور زندہ و بیدار قوم کا یہ شعار ہوتا ہے کہ وہ خود کو فعال و سرگرم اور پر جوش رکھنے کے لیے قومی اہمیت کے حامل دنوں کو کبھی فراموش نہیں کرتی بلکہ انہیں ہمیشہ یاد رکھتی ہے اور جب بھی سال بعد وہ دن آتا ہے تو پورے جوش و جذبے اور ذوق وشوق کے ساتھ اسے مناتی ہے تاکہ نئی نسلیں بھی اس کی افادیت واہمیت سے آگاہ ہوں اور ان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا داعیہ پیدا ہو جس نے انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو اور پوری قوم کو اس نعمتِ عظمیٰ سے نوازا، حریت فکر، مقامِ بندگی اور حصولِ سعادت کے آداب سے آشنا کیا اور یہ ذوق ودیعت کیا کہ میدان میں آئیں اور اپنی آزادی و بقاء، عقائد ونظریات اور تہذیب وشعار کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور کسی کو قومی وجود کی طرف دستِ تعدی دراز کرنے اور نظریاتی سرحدوں پر شب خون مارنے کی اجازت نہ دیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیر کے دن روزہ رکھا کرتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (''اَنَا وُلِدْتُ'') میں روزہ اس لیے رکھتا ہوں کہ اس میں میری ولادت ہوئی ہے۔ اُمت کے لئے اس سے بڑھ کر قومی اہمیت کا دن اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے دن کو دھوم دھام سے منانا، جائز حدود کے اندر رہ کر خوشی کا اظہار کرنا، غربا ومساکین کو کچھ کھلانا، روزہ رکھنا، عبادت کرنا، دُرود وسلام کا نذرانہ پیش کرنا، اس دن کے حوالے سے ضروری ہی نہیں بلکہ سعادت مندی کی دلیل بھی ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس دن کو منایا اور اسے روزے کے لیے خاص کیا تو نیاز مند اُمت کا بدرجہ اولیٰ یہ فرض بنتا ہے کہ اسے خصوصیت کے ساتھ منائے اسے ذکر ودعا اور

دُرود وسلام کے لیے مختص کرے اور اپنے عظیم نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہو۔

میلاد کیلئے ''عید'' کے لفظ کا استعمال:۔

بعض کج فہم، کور ذوق میلادِ مصطفٰے کیلئے لفظ ''عید کا استعمال'' انتہائی بُرا تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ اہل تحقیق کے نزدیک یہ کوئی قابل گرفت امر نہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ''حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بارگاہِ کبریائی میں عرض کرتے ہیں:۔

''اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے عید ہو، ہمارے اگلوں پچھلوں کی'' (پارہ ۷، رکوع ۵)

بخاری ''کتاب الایمان'' میں روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک یہودی کہنے لگا کہ ''اے امیر! تمھاری کتاب میں ایک ایسی آیت ہے کہ اگر ہم پر وہ نازل ہوتی تو ہم اس کے ''یوم نزول'' کو عید قرار دیتے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ''وہ کونسی آیت ہے'' وہ بولا!

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل فرمایا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو چننے کے لیے راضی ہو گیا'' (پارہ ۶، رکوع ۵)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس دن کی اہمیت اور اس کے مقام کو ذہن نشین کر لیا ہے۔ قرآن پاک اور صحاح ستہ کی عظیم کتاب بخاری شریف کی حدیث سے یہ بات مُترشّح ہو رہی ہے کہ نعمت کے ملنے کے دن کو اور قرآنِ پاک کی آخری آیت کے نزول کے دن کو عید کہا جا رہا ہے۔ ذرا سوچنے کی زحمت گوارا کریں کہ یہ تمام تر تعریفیں آخر کس کے صدقہ مل رہی ہیں؟ قرآنِ پاک کی آخری آیت نازل ہو تو عید کی خوشیاں حاصل ہو جائیں اور اگر خاتم النبین تشریف لائیں تو پھر ہم کیوں نہ عید منائیں۔ حقیقت میں یہی تو عید ہے کیونکہ سب عیدیں اور خوشیاں اسی عید کے صدقے ملی ہیں۔

میلاد اور قرآن پاک:۔

اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ دیا میں نے تم کو کتاب اور حکمت سے پھر آیا تمہارے پاس عظمت والا رسول، جو تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو

تمھارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اس کی ضرور مدد کرو گے۔ (آل عمران، ۸۱)

اس آیت میں ذکر مصطفیٰ ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشریف آوری کا ذکر سب سے پہلی محفل جو صرف انبیاء کی تھی میں ہوا۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے میلاد کا ذکر کرنے والا خدا اور سامعین انبیاء تھے۔ علاوہ ازیں قرآنِ پاک سارے کا سارا شان مصطفیٰ بیان کررہا ہے۔ قرآنِ پاک میں موجود جملہ آیات ذکرِ رسول کی شمع سے منور و مُستنیر ہیں۔

میلاد اور حدیث:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی محفل میں اپنا میلاد یوں بیان کیا ''میں تم کو اپنے ابتدائی معاملات کی خبر دیتا ہوں، میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری ہوں اور میں اپنی والدہ کا وُہ چشم دید منظر ہوں جو انہوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا تھا کہ ان کے جسم پاک سے ایک ایسا نور نکلا جس کی روشنی میں شام کے محلات نظر آ گئے'' (مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین، ۵۱۳)

اس حدیث پاک سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے اجتماع میں خود اپنی محفل میلاد منعقد فرمائی، اور اپنی ولادت، اپنا حسب نسب، اپنی خاندانی شرافت کا بیان فرما کر اپنی اُمت کو بھی میلاد منانے کی ترغیب عنایت فرمائی۔

میلاد اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین:۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں نعتیہ قصیدے لکھے اور پڑھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان پر اظہار خوشنودی فرمایا اور اُن کے لیے یوں دعا مانگی۔

اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ = ''اے اللہ (حسان) کی مدد فرما روح القدس کے ساتھ'' (بخاری ج ا ص ۲۵)

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے نعتیہ اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ولادت کا تذکرہ بھی فرمایا۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محفل میں تلاوت، نعت، تقریر (میلاد کے موضوع پر یا

سیرت کے موضوع پر) اسلام، اور قرآنِ پاک پڑھا ہوا طعام، یہ تقریباً جلسہ میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارکانِ خمسہ ہیں اور انہی پر تقریباً عرصہ دراز سے عمل ہو رہا ہے۔ دورِ رسالت، دورِ صحابہ، دورِ تابعین، دورِ تبع تابعین، دورِ اولیائے کاملین میں متقدمین اور متاخرین سلف صالحین کسی نہ کسی شکل میں میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محافل سجاتے رہے ہیں۔

میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محفل کی ہیئت کذائی میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے کسی ذی شعور کو اعتراض ہو اگر ہوگا تو موجودہ طور طریقوں سے ہوگا۔ میلا دالنبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے جلسے کا موازنہ دورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا دورِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین سے کرتے ہیں تو وہاں اگر چہ یہ انداز نظر نہیں آتا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت کے تذکرے ضرور ہوئے۔ اس کے برعکس ایسی باتیں ہیں جو زمانہ نبوّت میں نہ تھیں لیکن اب ہیں اور سب بسر وچشم اُن کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ لیکن سال کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت کا مہینہ آتا ہے تو آسمان سر پر اُٹھالیا جاتا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے دور میں نہیں ہوا اب کیوں ہو رہا ہے۔

قرونِ اولیٰ کے برعکس امور جن پر سب متفق ہیں (اختلاف ہے تو صرف میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلسے پر) درج ذیل ہیں۔

(1) مسجدوں کا پختہ کرنا (۲) مسجدوں کو مزیّن کرنا
(۳) لاؤڈ سپیکر کا استعمال (۴) قرآن مجید پر زیر زبر لگانا
(۵) عید ملن پارٹی کا اہتمام کرنا (۶) یوم خلفائے راشدین منانا
(۷) درس نظامی قائم کرنا

علی ھذا القیاس کئی مروجہ امور ایسے ہیں جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیے تھے اور نہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے کیے لیکن ہم بباانگ دہل کرتے ہیں۔ تو کیوں نہ ایسا ہو کہ ہم میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلسوں اور ذکرِ ولادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پروگراموں جن کی برکات سے اپنے تو اپنے غیر بھی محروم نہیں ہوتے سے سمجھوتہ کریں اور دین و دنیا کی بھلائیاں اپنے دامن میں سمیٹیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

''صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس''

امت کے بہترین افراد کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ ایسے نفوس قدسیہ ہیں جن کے پیشِ نظر نزول وحی ہوتا ہے۔ جن کی نظریں جلوۂ نبوت کا طواف کرتی ہیں۔ جن کے کانوں سے زبانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نکلنے والے الفاظ معانقہ کرتے ہیں، جن کی کفِ پا نقش نعلینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں، جن کے شب وروز معجزات نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نظریں جن کی تربیّت کرتی ہیں، جن کی آنکھوں میں نبوت سراپا، قلوب واذہان میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سوچ اور تعمیر میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کردار پیش نظر ہوتا ہے۔

جس طرح جملہ انبیاء کرام علیہ السلام میں گنبدِ خضریٰ کے مکین کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی بھی مثال دیگر انبیاء علیہ السلام کے صحابہ سے نہیں ملتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جانثار تھے لیکن جانثاری کی جو مثالیں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے قائم کیں۔ تاریخ کے اوراق ایسی مثال سے قاصر ہیں۔ تاریخِ اسلام کا مؤرخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، تاریخِ عالم رقم کرنے والے جملہ مؤرخین ایک عظیم محبت اور جانثاری کی مثال دینے کیلئے اپنے لبوں کو اور اپنے قلم کو جنبش دینے میں بے بس نظر آتے ہیں۔ سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا اوڑھنا بچھونا سنتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھی۔ ''صدیق کیلئے ہے خدا کا رسول بس'' یہ ان کی کتاب زیست کا جلی عنوان تھا اور ان کی پوری شخصیت اسی عنوان کے گرد طواف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ علم و دانش اور فضائل حسنہ کا مہر عالم افروز ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ شعور

وآگہی کے میدان کے شاہ سوار ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت و مرتبت کے ناقوس پورے عالم اسلام میں بج رہے ہیں ان کے گلستانِ محبت ومؤدت کی جس گلِ اقدس کی طرف نظر اٹھتی ہے پلکوں پر تازگی وطراوت کے موتی چمکنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اوراس گل حق وصداقت کی عطر بیز خوشبو سے مشامِ جام معطر ہو جاتا ہے۔ ان کے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عزم و استقامت، انفاق فی سبیل اللہ، زہد وتقویٰ، فہم وتدبر، سخاوت وایثار، شرافت ونجابت، حلم، تحمل بردباری، جرأت و بہادری، اکرام ضعیف، دستگیری ناتواں، حمایت بے کساں جیسے طرز زندگی اورمنفرد اندازِ حیات نے ان کو معاصرین میں یکتائے روزگار بنادیا ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ ۵۷۳ء میں مکہ میں پیدا ہوئے، قبل از اسلام آپ رضی اللہ عنہ کو عبدالکعبہ کے نام سے پکارا جاتا تھا اور جیسے ہی آپ رضی اللہ عنہ نے غلامیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پٹہ گلے میں ڈالا، چوکھٹ مصطفوی پے جبین نیاز رکھنے کا موقع ملا اور آفتابِ دینِ اسلام کی مستنیر شعاؤں نے جب آپ رضی اللہ عنہ کی شمع کو روشن کیا تو آپ رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی عبدالکعبہ سے عبداللہ میں تبدیل کردیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ قریش کے معزز قبیلے بنوتمیم سے تعلق رکھتے تھے، شجرۂ نسب دونوں طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوبکر تھی، ابوبکر کا مفہوم ''پہل'' کرنا ہے کے معنی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ تمام قابل ستائش اعمال میں سبقت لینے والے اور پہل کرنے والے تھے۔ اس لیے ابوبکر مشہور ہوئے۔ سب سے پہلے جو نابغۂ روزگار ہستی زیورِ اسلام سے مرصعّ ہوئی وُہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر ہے کہ میں نے جس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس میں فکر وتردّد کی جھلک محسوس کی۔ لیکن جب میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہوں نے بلا جھجک اسے قبول کرلیا۔ آزاد اور بالغ مردوں میں سب سے پہلے اس رجل رشید نے ۳۸ سال کی عمر میں ۶۱۰ء میں اسلام کی خلعتِ فاخرہ زیب تن فرمائی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے تبلیغِ اسلام اورانفاق فی سبیل اللہ میں بے مثال کردار ادا کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی مساعی جمیلہ سے اکابرِ صحابہ مشرف بہ اسلام ہوئے اس کے علی الرغم اپنی جیب خاص سے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ اور کئی دوسرے غلام خرید کر آزاد کئے علاوہ ازیں حضرت ہندیہ رضی اللہ عنہا اور دوسری کئی کنیزیں جن کی تعداد تقریباً سات لکھی ہے خرید کر آزاد کیں۔

اسلامی غزوات کے موقع پر آپ رضی اللہ عنہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے گرد پروانہ وار نظر آتے ہیں۔ غزوہ تبوک کے موقع پر گھر کا سارا اثاثہ یہ کہتے ہوئے پیش کرتے ہیں **ابقیت لھم اللہ ورسولہ**۔یعنی ان کے واسطے اللہ اور اس کا رسول چھوڑ آیا ہوں۔

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

انتہائی بردبار اور تحمل مزاج انسان تھے۔کئی مواقع ایسے آئے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی بردباری اور موقع شناسی کی بدولت بڑے بڑے خطرناک قسم کے واقعات رونما ہونے سے رُک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہری وصال کے موقع پر مدینہ منورہ میں کہرام مچ جاتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے، عجیب بے چینی، پریشانی اور افراتفری کا عالم ہے۔لوگ اضطرابی کیفیت سے دوچار ہیں۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اعلان فرماتے ہیں کہ جو یہ کہے کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے ہیں تو میں اس کا سر قلم کردوں گا لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس بے چینی اور بے کلی کا پتہ چلتا ہے تو فوراً مسجد نبوی میں تشریف لاتے ہیں ''بعد از انبیاء بزرگ تر'' کے مصداق یہ انسان عظیم فیصلہ کرتا ہے جس سے دنیا کے نہایت زیرک اور فطین قضاۃ انگشت بدنداں ہیں، کہ ایسے شخص کے سامنے جس کی ہیبت کے سامنے قصرِ کفر وشرک میں سکونت پذیر انسان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے آپ رضی اللہ عنہ پُر شگاف انداز میں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ'' لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا چکے ہیں۔لیکن خدائے قدوس قائم و دائم ہے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہمارے اندر موجود ہے، اس لئے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' آپ رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے تمام لوگ سنبھل جاتے ہیں۔ ہر ایک کی ڈھارس بندھ جاتی ہے، افراتفری اور بے چینی کی گھٹائیں چھٹ جاتی ہیں اطمینان وسکون کی قوسِ قزح نمودار ہو جاتی ہے، اور''**کل نفس ذائقۃ الموت**'' کا مفہوم اپنی رعنائیوں کے ساتھ سمجھ میں آجاتا ہے۔موت برحق ہے ہر ایک نے مرنا ہے، ہر ایک کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کرنا ہے، موت پر تمام مسالک اور فرقے متفق ہیں۔ یہاں تک کہ انبیاء علیہ السلام جیسی عظیم ہستیوں نے بھی اس مرحلے سے گزرنا ہے اگرچہ

یک آن ہی کے لئے کیوں نہ ہوا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ازاں بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ مقام صدیق رضی اللہ عنہ کو سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی بے قراری اور بے چینی کا اظہار کرتے تو خدا جانے کتنے فتنے رونما ہو جاتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سفر میں، حضر میں ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا اور آج مزار میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آرام فرما ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ دوسال اور تقریباً چار ماہ خلافت کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ۶۳ سال کی عمر میں ۲۲ جمادی الآخری ۱۳ھ کو وفات پائی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

(ماخوذ کراماتِ صحابہ)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ "اصحابی کالنجوم بایھم اقتیدتم اھتدیتم" میرے صحابی رضی اللہ عنہ ستاروں کی مانند ہیں ان کی اقتداء کرو ہدایت پا جاؤ گے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی زندگیوں کا نہ صرف مطالعہ کیا جائے بلکہ ان کی حیات مبارکہ کو مشعلِ راہ بنا دیا جائے۔ ان کی زیستِ طیبہ کو اپنا کر ہی اپنی زندگی میں رعنائیاں بکھیری جاسکتی ہیں۔ ان کے افعال واقوال پر عمل پیرا ہو کر اپنے معاملات میں نکھار پیدا کیا جائے۔ صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں بنتے۔ حقیقی محبت صحابہ رضی اللہ عنہ کی ضرور رنگ لائے گی، زبان سے صبح وشام صحابہ رضی اللہ عنہ کا راگ الاپتے رہیں اور ہمارے اعمال ان کے فرامین کے برعکس ہوں تو یہ بات قطعاً محمود و مستحسن نہ ہے یہ ظاہری محبت آپ کے اپنے ضمیر کو تو کچھ ایّام کے لئے مطمئن کر سکتی ہے لیکن سلف صالحین سے حقیقی محبت کی چاشنی صرف ان لوگوں کو نصیب ہوگی جن کی زندگیوں میں ان نفوس قدسیہ نے اپنے اعمال کے ذریعے انمٹ نقوش چھوڑے ہوں گے اور یہ خوش نصیب طبقہ ہی دین و دنیا کی خوشیاں سمیٹتا ہے اور دنیا کے ساتھ آخرت میں بھی وافر حصہ وصول کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی حیاتِ مبارکہ میں عملاً صحابہ رضی اللہ عنہ کی محبت رچ اور بس چکی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہ پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے

ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

سیدنا علی المرتضی رضی اللہ تعالی عنہ

کعبہ کی حرمت مترشّح ہے، جس کو طواف کعبہ کی سعادت حاصل ہو جائے ، اُس کو دیگر شخصیات میں ایک ارفع مقام مل جاتا ہے۔ کیوں کہ صاحب ایمان طوافِ کعبہ سے حج وعمرہ کی سعادت حاصل کر لیتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے قریہ قریہ سے کوچہ کوچہ سے آئے ہوئے حضرات مناسکِ حج وعمرہ ادا کرتے ہوئے اپنی قسمت پر نازاں نظر آتے ہیں کوئی سیّد ہے تو وہ بھی مطاف میں موجود، کوئی افغانی ہے تو وہ بھی مطاف میں موجود، کوئی ایرانی ہے تو وہ بھی کبھی حجرِ اسود کے سامنے سے گزرتا ہے، کبھی مقامِ ابراہیم پر نوافل ادا کرتا ہے۔ ان سب مقامات کو جو عظمت ملی ہے وہ کعبہ معظّمہ کی وجہ سے ہے، ان مقامات مقدسہ کے علاوہ ایک نابغۂ روزگار ہستی ایسی بھی ہے جس نے کعبہ شریف کے اندر جنم لیا ہے اور وہ سیّدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ (مولودِ کعبہ) ان کو نہ صرف قربتِ کعبہ میسر آئی بلکہ کعبہ کے اندر پیدائش کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

کسے را میسّر بجز ایں سعادت
بہ کعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

شہنشا واقلیم ولایت، منبع علم وعرفاں، راز دارِ محبوبِ خدا، مشکل کشا، مخزن صدق وصفا سیّدنا علی کرّم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم ۱۳ رجب ۳۲ سال قبل از ہجرت بروز جمعۃ المبارک بزم ہستی میں رونق افروز ہوئے۔ (ضیاء الواعظین)

آپ رضی اللہ عنہ کا نام علی رکھا گیا آپ کی کنیت ابوالحسن اور ابوتراب ہے۔ آپ وادی بطحا کے نامور سردار اور اہل حرم میں معزز ترین فرد ابوطالب کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کی والدہ

ماجدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم ہیں، آپ رضی اللہ عنہ فاطمہ بنت اسد سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ بعد از ہجرت مدینہ منورہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قمیض اتار کر انہیں پہنائی۔ ان کی قبر میں کچھ دیر لیٹے رہے۔ بچوں میں سب سے پہلے اسلام کی خلعتِ فاخرہ زیبِ تن کرنے والے علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔

بخاری و مسلم نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ آقا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی۔

ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے درمیان مؤاخات قائم فرمائی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ روتے ہوئے سرکار کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے درمیان تو مؤاخات قائم فرما دی ہے لیکن مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھوڑ دیا ہے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (تو دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے)۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کے چہرے پر نظر ڈالنا عبادت ہے۔ (طبرانی) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے علی رضی اللہ عنہ کو گالی دی پس اس نے مجھے گالی دی (احمد، حاکم)

قرآن کے علم کے ساتھ ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن پر عمل کرنے میں بھی دوسروں پر سبقت لے جانے والے تھے۔ سورۂ مجادلہ کی آیت نمبر ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تخلیہ میں بات کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً اِس پر عمل کیا۔ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن جلد پنجم میں اس آیت کی تشریح میں ابن جریر کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی یہ ایک ایسی آیت ہے جس پر میرے سوا کسی نے بھی عمل نہیں کیا۔ اس حکم کے آتے ہی میں نے صدقہ پیش کیا اور مسئلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ لیا۔ یہ حکم صرف ایک دن یا دوسری روایت کے مطابق دس دن تک باقی رہا۔ آیت نمبر ۱۳ میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور صدقہ دینا ضروری نہ رہا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بچپن سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک تقریباً تیس سال تک اپنی زندگی ان کی خدمت اور رفاقت میں بسر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً ۳۰ سال تک مسند ارشاد پر متمکن رہے۔ پہلے تین خلفائے راشدین کے عہد میں دعوت، ارشاد اور قضاء کی خدمت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد رہی اور اپنے زمانہ خلافت میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیض جاری رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد ''۵۸۶'' ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تک روایتیں درج ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں کتب حدیث بھری پڑی ہیں، تواریخ کی کتب کی اگر ورق گردانی کریں تو یہ بات اظہر من الشّمس ہے بعض فضیلتوں میں مولودِ کعبہ منفرد دیکتا ہیں۔ اسلام کی تاریخ کی تکمیل بھی ایسی صورت میں تصور کی جاتی ہے۔ جس میں اقلیم ولائت کے شہنشاہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہو۔ ذکر شیرِ خدا سے جہاں طبیعت میں طراوت محسوس ہوتی ہے وہاں روحانی طور پر بھی قلب واذہان میں مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ شجاعت میں، سخاوت میں، ایثار و قربانی میں، جرأت و بہادری میں، امانت و دیانت میں، اخوت و بھائی چارہ میں، حلم و بردباری میں، اتحاد واتفاق میں الغرض ہر میدان میں محاسن وفضائل کے فلک کے آفتاب وماہتاب نظر آتے ہیں۔

آج اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس سلف صالحین کے نقش قدم پر چل کر اپنے کردار کی سمت کا تعین کریں۔ صرف زبانی جمع خرچ سے اپنی عقیدت کا اظہار کاغذی ناؤ کی مانند ہے جہاں موج اُٹھی اُس کو نیست ونابود کرنے کیلئے وہ کافی ہے اور پھر اُس کا وجود موجود نہ رہے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقیدت رکھنے والے تو بے شمار ہیں لیکن حقیقت میں آپ رضی اللہ عنہ کا محبّ وہ ہے جو نماز کا پابند ہو، جو جھوٹ سے متنفر ہو، جو غیبت اور چغلی سے کوسوں دور بھاگتا ہو جو بزدلی کے بحرِ بیکراں کا غوّاص نہ ہو، جو بددیانتی اور اقرباء پروری جیسی قبیح عادات کا حامل نہ ہو۔ جس کے وعظ میں نصیحت ہو، جس کے خطبے میں پیار ومحبت کے گل کھلتے ہوں، جس کی تحریر ہمدردی اور اخوت کا باعث بنتی ہو، جس کے کردار کے شجر سایہ دار میں عوام النّاس کے خودرو پودوں کو تقویت نصیب ہوتی ہو۔

ان مذکورہ خصوصیات کا حامل شخص ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حقیقی محبّ اور عقیدت مند ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے دعویدار اپنے گریبان میں جھانکیں کہ کیا وہ ایسے خصائل کے لئے کوشاں ہیں، کیا وہ ان خصوصیات کے حصول کی خاطر کوئی تگ ودو کر رہے ہیں، کیا شیرِ خدا سے

محبت صرف یہی تقاضا کرتی ہے کہ نعرے تو بانگ دہل لگائے جائیں لیکن کام وہ کیے جائیں جس سے روحِ دامادِ رسول کو تکلیف پہنچے۔۔۔خدارا اس طرف توجہ کی ضرورت ہے ورنہ کل قیامت کے دن ہم محبوبِ خدا کے سامنے سوائے شرمساری اور ندامت کے کچھ ظاہر نہ کرسکیں گے۔کوفہ میں ۱۷رمضان المبارک ۴۰ھ کے روز ایک بدبخت خارجی عبدالرحمٰن ملعون نے نمازِ تہجد کے وقت آپ رضی اللہ عنہٗ پر حملہ کیا زخم مہلک تھا، دو دن زندہ رہے، ۲۰رمضان المبارک کو جمعہ کی رات اسلام کا یہ بدرِ منیر (ظاہری دنیا سے) ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

حضرت امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

(امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ)

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا زبزم عشق یک دانائے راز آید بروں

کائنات کا نظام قانونِ قدرت کے مطابق چل رہا ہے، حیات وممات کے اپنے مراحل ہیں شمس وقمر کے اپنے اپنے مدار ہیں، باغِ حیات میں گلہائے رنگارنگ کا وجود اپنی زیست کا ثبوت مہیّا کرتا ہے۔ گگن کی وسعتوں میں ظلماتِ شب کو اجالا بخشنے والے کواکب رنگینیاں بکھیر رہے ہیں، بادِ نسیم کے مسحور کن جھونکے عروقِ مردہ میں حیات بخش قطروں کی ترسیل کا سبب بن رہے ہیں۔ فلک بوس پہاڑ، شاہینوں کی پرواز، مجاہدوں کی للکار، صوفی کی تسبیح، کسان کی جُہدِ مسلسل، مومن کی شبِ بیداری، خطیب کا خطبہ، واعظ کا وعظ، منصف کا فیصلہ یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ کوئی تو ہے جس نے یہ سارا نظام سنبھال رکھا ہے، اور وہ ایک خدا ہے۔

؎ جو دن کو رات اور رات کو دن بنا رہا ہے وہی خدا ہے

مختلف اوقات میں مختلف لوگ خدا تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ اُن کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا فرماتا رہا، ان نفوسِ قدسیہ میں ایک عظیم نام نعمان بن ثابت بن مرزبان (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) کا ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کا نام نعمان، ابوحنیفہ کنیت، امام اعظم بالاتفاق لقب ہے آپ

رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ابوحنیفہ آپ کی اولاد کی وجہ سے نہیں بلکہ کنیت وصفی ہے یعنی **ابا الملۃ الحنیفہ** اور بوجہ آیت مبارکہ " **واتبعوا ملۃ ابراھیم حنیف**" ابراہیم حنیف کی ملت کی اتباع کرو۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کنیت ابوحنیفہ اختیار فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اسے شرفِ قبولیت بخشا جو اصل اسم ''نعمان'' پر غالب آ گئی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا سنِ ولادت متفق علیہ اور مشہور روایت کی بنا پر ۸۰ھ ہے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے، امام صاحب نسلاً فارسی ہیں، آپ کا سلسلہ نسب کچھ یوں ہے:

نعمان بن ثابت، بن نعمان بن مرزبان بن قیس بن یزگرد بن شہر یار بن نوشیرواں (حدائق الحنیفہ) علامہ ابن حجر مکی شرح مشکوٰۃ شریف میں فرماتے ہیں کہ (ادرک الامام الاعظم ثمانیۃ صحابہ) آپ نے آٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تابعی ہونا متعدد روایات سے ثابت ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے کہنے پر تحصیلِ علم کی طرف توجہ دی، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً ۱۸ سال تک امام حمّاد رحمۃ اللہ کی دہلیز پر بیٹھ کر زانوئے تلمّذ طے کیا، اور تحصیلِ علم کیلئے شب و روز کوشاں رہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت کے کہنے پر میں فقہ کی طرف متوجہ ہوا۔ عورت سے ملاقات میرے لئے مہمیز ثابت ہوئی اور میں امام حمّاد رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر فقیہ بن گیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے استاد امام حمّاد رحمۃ اللہ علیہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ فقہ میں آپ رحمۃ اللہ علیہ امام حمّاد رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ ہیں لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر اساتذہ کرام سے بھی استفادہ کیا ہے۔ بعض حضرات نے امام صاحب کے اساتذہ کرام کی تعداد ۹۹ بتائی ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۴/ شعبان المعظم ۱۵۰ھ بروز جمعہ وصال فرمایا اور آپکو بغداد شریف میں دفن کیا گیا۔ (وفیات الاخیار، صفہ نمبر ۱۰۰، از مولانا محمد احسن چشتی صابری، ناشر سنی دارالاشاعت علویہ رضویہ ڈجکوٹ روڈ، فیصل آباد)، فرمانِ باری تعالیٰ ہے ''مہاجرین اور انصار میں سابقین الاولین اور جن حضرات نے نیکیوں میں اتباع کی اللہ نے ان سب کو پسند کیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے'' (القرآن)، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث شریف کی روشنی میں بھی علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے افضل التابعین میں شمار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے ''اگر ایمان ثریّا کے پاس بھی ہوگا تو ابنائے فارس میں سے ایک شخص اس کو وہاں سے اتار لائے گا۔''

(مسلم) بالاتفاق اس حدیث کا مصداق ابوحنیف نعمان بن ثابتؒ ہیں، (سیوطی)

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دہریہ سے مناظرہ ہوتا ہے، وقت کا تعیّن کر دیا جاتا ہے، فریقین ایک مقامِ خاص پر جمع ہو جاتے ہیں، عوام النّاس کا جمِّ غفیر ہے۔ امام صاحبؒ پُر سکون وطمّانیت کا تاج سجائے اس محفل کو زینت بخشتے ہیں، وقتِ مقررہ سے تاخیر میں پہنچنے والا فرشتہ نما شخص جس کو پوری دنیا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے پہچانتی ہے، تاخیر کی وجہ پوچھنے پر پُر وقار انداز میں یوں جواب دیتا ہے کہ میں نے آج سیر کے دوران یہ دیکھا ہے کہ ایک جگہ پر خود بخود ایک شجر سایہ دار نمودار ہوتا ہے، پھر وہ اچانک خشک ہو جاتا ہے، اپنے آپ ہی اُس کے تختے بن جاتے ہیں خود بخود ایک کشتی نمودار ہو جاتی ہے اور ایک ناخدا اُس کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیتا ہے اور میں اس میں سوار ہو کر بحری فضاؤں کی موجودگی کا لطف اٹھانے لگ جاتا ہوں۔ میرا دیر سے پہنچنا بدیں وجہ تھا۔ فوراً دہریہ چیخ اُٹھا کہ اتنا بڑا امام ہو کر جھوٹ بول رہا ہے، درخت خود بخود پیدا ہو جائے، اپنے آپ کشتی نمودار ہو جائے اور بغیر کسی ذریعے کے وہ سمندر اور دریا میں تیرنا شروع کر دے، عقل یہ سب کچھ ماننے سے فرار حاصل کر رہی ہے یہ ناممکن ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اے منکرِ خدا! سن اگر یہ چھوٹا سا کام اپنے آپ نہیں ہو سکتا تو دنیا کا نظام اپنے آپ کیسے چل سکتا ہے؟ اس کو چلانے والی کوئی ذات ہے اور وہ خُدائے لم یزل ہے۔

کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے ، وہی خدا ہے

امام صاحب رحمۃ اللہ عنہ کی اِس عقلی دلیل سے کفر کو منہ کی کھانی پڑی اور اہل ایمان سرخرو ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی عمر مبارک کے تقریباً ۷۰ سال بیت گئے۔ زندگی کی ستر بہاریں دیکھنے والا یہ آفتاب و ماہتاب ہر طرف اجالا بکھیرتے ہوئے روپوش ہو گیا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر تمام شہر میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی، حسن بن عمارہ رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں بھی ہوتا ہے روتے روتے یہ کہتے جاتے تھے ''اللہ تعالیٰ آپ رحمۃ اللہ علیہ پر رحم فرمائے آپ رحمۃ اللہ علیہ نے تیس سال سے افطار نہیں کیا اور نہ ہی چالیس سال سے رات کو آرام کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ہم سب میں سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ عابد، سب سے زیادہ پرہیز گار تھے۔ (الخیرات الحسان) آپ کی نمازِ جنازہ چھ مرتبہ پڑھی گئی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے تین دن بعد تک مسلسل جنّات کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ دنیا میں لوگوں کی اکثریت آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید

کرتی ہے۔اس بات نے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ آج مغرب زدہ طبقہ اور آزاد روش حضرات کے نزدیک تقلید ایک بدترین عیب ہے۔اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے اور تعصب کی عینک اتار کر مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات مہر نیم روز کی طرح متبیّن ہے کہ تقلید نے ہر ایک کو سایہ کی طرح اپنے ساتھ پوست کیا ہوا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چھوٹے بڑے کی، غریب امیر کی، غلام آقا کی، شاگرد استاد کی، مرید مرشد کی، مؤکل وکیل کی اور محکوم حاکم کی تقلید میں ایّام زیست گزار رہا ہے، اور ایسے میں اپنی کامیابی تصور کرتا ہے۔اگر صبح سے شام تک دن سے رات تک، گھر سے بازار تک، نشست و برخاست میں، قیام وقعود میں، زندگی سے وفات تک اور پیدائش سے ایّام پیری تک جس لمحے پر بھی ہم نظر دوڑائیں کوئی ایسی ساعت میسر نہیں آتی جو تقلید سے خالی ہو۔ ہر کس و ناکس جبراً، قہراً یا رغبتاً اُس کو اختیار کئے ہوئے ہے اور جو تقلید کے معترضین ہیں وہ بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔پھر بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ مخالفت کیوں کرتے ہیں۔یہ کج فہمی، کورذوقی اور عقل کا دیوالیہ ہے کہ ہر کام میں تقلید آخرت کے معاملہ میں مادر پدر آزادی۔کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآنِ پاک کی تقلید نہیں کی، کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تقلید نہیں کی۔یا ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کا معاملہ رہا ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو متقدمین اور اسلاف کی تقلید سے کیوں انحراف ہے۔حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ میرے کسی قول کے مقابلے میں حدیث پاک آجائے تو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نور کے سامنے سر تسلیم خم ہے اور میرے قول کی کوئی نوعیت نہ ہے۔ آپ یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا کے قائل تھے یہی وجہ ہے کہ آج ان کے مجتہدات پر عمل کرنے والوں کی تعداد دیگر آئمہ مجتہدین سے کہیں زیادہ ہے۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرتِ نعمان اپنائی جائے۔رمضان المبارک میں آپ کا وتیرہ تھا کہ ۶۰ مرتبہ قرآنِ پاک ختم فرمایا کرتے تھے، حضرت محارب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کوئی شب بیدار نہ تھا، حسن بن عمار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ پر رحم فرمائے کہ تیس سال تک نہ افطار کیا اور نہ چالیس سال تک رات کو بستر سے کمر لگائی۔امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ زندگی قرآن وسنت کی روشنی میں گزاری جائے، آنے والی ہر مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔دینِ اسلام کی سربلندی کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ

کیا جائے، دین اسلام کے علم کو سرنگوں کرنے ولی ہر طاقت کا قلع قمع کر دیا جائے، ان کا مقلد بننا اور کام غیر مقلدوں والے کرنا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے فرامین کی جملہ جہتوں کا رُخ قرآن وسنت کی جانب ہوتا ہے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی حقیقی تقلید اسی میں ہے کہ دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے جملہ صلاحیتیں بروئے کار لائی جائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ریاست کا عزم: فرقہ واریت اور متشدد رویوں کا خاتمہ

ریاست کا وجود عوام النّاس کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا، ریاست میں موجود ارباب حل وعقد ریاست کے جملہ امور اگر اسلامی خطوط پر چلانے کے خواہشمند ہوں تو ریاست واقعی انعام خداوندی ہے۔ اگر ریاست کے ارباب بست وکشاد کے اذہان مفلوج ہو چکے ہوں تو پھر ان سے فلاح و بہبود کی توقع عبث ہے۔ فرقہ واریت ایک ناسور ہے جو معاشرے کے حسن کو گہنا رہا ہے۔ ایک مردار ہے جس کے تعفن سے حیات کا وجود ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ایک خدا، ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ایک قرآن کے ماننے والے جب آپس میں دست وگریباں ہوں، جب نور وظلمات کی تصویر پیش کر رہے ہوں، جب دھواں اور سائے کا تصور پیش کر رہے ہوں، جب پھول اور کانٹے کا نمونہ پیش کر رہے ہوں، تو پھر اس رنگ وروغن سے بنی ہوئی معاشرے کی تصویر کبھی بھی اسلامی معاشرہ کہلانے کی روادار نہیں۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

فرقہ واریت کا خاتمہ صرف اس صورت ممکن ہے کہ قوتِ برداشت کا عملی مظاہرہ کیا جائے، انسانیت سے پیار کیا جائے اگر کسی کے نظریات میں تفاوت موجود ہے تو بطریقہ احسن اس کی رہنمائی کی جائے۔ اور یہ کام ریاست بدرجہ اتم کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس میں مخلص ہو تعلیمی نصاب میں تبدیلی سے بھی منزل حاصل کی جا سکتی ہے۔ اوّل سے لے کر ایم۔اے لیول تک فرقہ واریت والے مضمون شامل نہ کیے جائیں خطیب چونکہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے اچھے مواقع کا حامل ہوتا ہے وہ بھی اپنی نجی محفلوں میں فرقہ واریت کے نقصانات پر واضح روشنی ڈال سکتا ہے۔ خطیب بالخصوص

اپنے خطبہ جمعۃ المبارک میں عام معاشرتی مسائل پر روشنی ڈال کر اور فرقہ واریت کے عنوان سے نفرت کا اظہار کر کے کما حقہ اپنے خطبہ کو مؤثر بنا سکتا ہے۔ اور ریاست اپنے عزائم کی تکمیل میں جو اس نے فرقہ واریت اور متشدد رویوں کے خاتمے کے لئے تیار کر رکھے ہیں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔

خطبہ جمعۃ المبارک اگر پورے ملک میں ایک ہو جائے طبع کر کے خطیب کے پاس پہنچا دیا جائے اور اذان کا وقت ایک ہو جائے تو اس عمل سے فرقہ واریت اور متشدد رویوں کا عفریت تن بے جان کی شکل اختیار کر جائے گا۔ اور فرقہ وارانہ نظریات دم توڑ جائیں گے۔ اشرافیہ اگر ان قبیح برائیوں کے خاتمے کے لئے عزم صمیم کر لے تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرے کے گلشن میں رواداری، اخوت، بھائی چارہ اور یک جہتی و یگانگت کے پھول نہ اگیں، اس کے اختتام کے لئے ابتدائی سطح سے لے کر انتہا تک کتر بیونت کی ضرورت ہے۔ فرقہ واریت اور متشدد رویوں کے بنیادی اسباب کی بیخ کنی کی جائے۔ خیر سگالی جذبات کو پروان چڑھانے کے لئے، محبت کے پودے کو شجر سایہ دار بنانے کے لئے، نفرت وعداوت ظلم و بربریت اور تعصب کی متعفن فضاء سے کنارکشی کرنا ہوگی۔

پاکستان گزشتہ کئی دہائیوں سے بالعموم اور 2001 سے بالخصوص 5000 افراد بشمول فوج اور پولیس کے اہلکار کی ہلاکت کی صورت میں تباہی کا سامنا کر چکا ہے۔ دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ٹارگٹ کلنگ کے پیشِ نظر وہ اپنا ہدف پورا کرتا ہے وہ نہیں دیکھتا کہ کتنے بیٹے باپ کے سائے سے محروم ہو رہے ہیں، اسے نظر نہیں آتا کہ کتنی عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں، کتنی خواتین کا سہاگ لٹ رہا ہے کتنے گھروں میں صف ماتم بچھ رہی ہے۔ گھروں کے گھر تباہ ہو رہے ہیں ادارے نشانہ بننے جا رہے ہیں یہ سب طاغوتی طاقتوں اور اسلام دشمن عناصر کے ایماء پر ہو رہا ہے۔ اس وقت پوری قوم کا ان متشدد رویوں کے خاتمے کے لئے ان کی بیخ کنی کے لیے متحد ہو جانا ایک انتہائی خوش آئند قدم ہے۔

فرقہ واریت کے خس وخاشاک گھر کے آنگن میں ہوں، کوچہ وقریہ میں ہوں، کسی نجی اجتماع میں ہوں، محراب ومنبر میں ہوں، جہاں کہیں بھی ہوں گلشن وحدت کی زیبائش کو ماند کر دیتے ہیں۔ دینِ اسلام کی شمع ہاتھ میں پکڑ کر فرقہ واریت اور متشدد رویوں کے اندھیروں کو اجالے میں بدلا جا سکتا ہے۔ آج ہمیں ان برائیوں کے خاتمے کے لیے پیہم جدوجہد کرنا ہوگی۔ خطیب خطبہ میں، مصنف اپنی تصنیف میں، شاعر اپنی شاعری میں، مؤلف اپنی تالیف میں، مضمون نگار مضامین میں فرقہ واریت اور متشدد رویوں کے خاتمے کے لیے کاوش کریں تو معاشرے میں حسن پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر

ہم اپنے عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے واشنگٹن کی طرف دیکھیں گے تو کامیابی ناممکن ہے اور اگر بحیثیت مسلمان حرمین شریفین کے نظارے ہمارے سامنے ہوں گے تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔ ہماری عظمت کا راز، ہمارے مقدر کے ستارے کی چمک اسلامی اصولوں کی پابندی میں مضمر ہے۔

فرقہ بندی اور تشدّد لعنت ہیں
ان سے باغی راشدؔ! اہلِ جنت ہیں

محنت میں عظمت

محنت میں عظمت سے مراد یہ ہے کہ کام کر کے، دست و باز و کو با مقصد متحرک کر کے، قلوب و اذہان کو طمانیت بخشتے ہوئے حصولِ عظمت کی خاطر جہد مسلسل کرنا، گورا ہو، کالا ہو، پست ہو، طویل القامت ہو، دُبلا پتلا ہو یا لحیم شحیم ہو، یہودی ہو، نصرانی ہو یا آتش پرست، الغرض جس مسلک یا مشرب سے منسلک ہو اس بات کا وہ ضرور معترف ہے کہ اگر کوئی عظمت، آن اور تفوق کے سہرے کو اپنے سر پر سجانا چاہتا ہے تو وہ صرف اور صرف محنت سے ہی ایسا کر سکتا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے ''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لئے وہ کوشش اور محنت کرتا ہے'' بنی نوع انسان کی تاریخ کے اوراق کا اگر مطالعہ اور مشاہدہ کریں تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جن سلف صالحین اور نابغۂ روزگار ہستیوں نے نام پیدا کیا وہ شب و روز محنت و مشقت کی چکی میں پستی رہیں۔ اقبال نام کے ہزاروں ہوں گے لیکن علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایک ہی ہے۔ اسی طرح غزالی رحمۃ اللہ علیہ، رازی رحمۃ اللہ علیہ نفیسی رحمۃ اللہ علیہ جیسے زعماء جو آسمان علم و دانش پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے یہ سب ان کی محنت لگن، کاوش اور انتھک جد و جہد کا نتیجہ تھا۔ محنت شاقہ اور جذبہ صادق ہو تو کہساروں سے بھی جوئے شیر نکالی جا سکتی ہے۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک ہے کہ ''حلال روزی کمانے والا (محنت کر نیوالا) اللہ تعالیٰ کا دوست ہوتا ہے۔'' نماز پنجگانہ ایک اہم عبادت ہے، زکوٰۃ ارکان اسلام سے ایک اہم رکن ہے، حج ایک اہم عبادت ہے لیکن ان جملہ عبادات پر نہیں اللہ تعالیٰ سے دوستی کا انعام صرف محنت کرنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔ طلباء خواہ دینی اداروں کے ہوں، جامعات اور کالجز کے ہوں اپنے مستقبل کو درخشندہ و تابندہ کرنے کیلئے محنت و مشقت کو عادت ثانیہ بنائیں۔ آرام طلبی، کاہلی، سستی اور غفلت کے پردے کو چاک کریں۔ معاشرے میں عظیم مقام پیدا کرنے کیلئے علم کے زیور

سے اپنے آپ کو مزیّن کریں یہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور موجودہ دور کا تقاضا بھی۔ کامیابی و کامرانی کے حصول کی خاطر جہد مسلسل کو اپنا وتیرہ بنائیں۔ کسی میدان میں فتح و نصرت کے جھنڈے لہرانے کیلئے محنتِ شاقہ پر مداومت جزو لاینفک ہے۔ کیونکہ پانی کا ایک قطرہ زمین چوس جاتی ہے اور جب تسلسل سے پانی پڑتا ہے تو ریگستان بھی سیلاب میں بدل جاتے ہیں۔

مشقت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی

تعلیم کی اہمیت

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرمانروائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

تاریخ کی ورق گردانی کریں تو یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ اس دنیا کے اندر جو بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے گئے وہ صرف اور صرف تعلیم ہی کی بدولت تھے۔ تعلیم ایک فرد میں جرأت مندی حوصلہ، دلیری، ثابت قدمی، قناعت پسندی، صداقت، لیاقت، امانت اور دیانت جیسی عظیم صفات کی موجودگی کا سبب بنتی ہے۔

قرآنِ پاک کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کی کتنی اہمیت ہے۔ حضرت آدمؑ مسجودِ ملائکہ بنے تو تعلیم ہی کے ذریعے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اشیاء کا علم سکھا دیا۔ طالوت کو بادشاہت ملی تو سبب علم ہی کو بتایا گیا۔ اگر حضرت یوسف کو سیاہ و سفید کا مالک بنایا گیا اور مصر کی بادشاہت ملی تو اس کا سبب بھی تعلیم ہی بنی۔ آپؑ نے فرمایا کہ اِنّی حَفِیْظٌ عَلِیم علاوہ ازیں متعدد مقامات پر تعلیم ہی کا ذکر ہے کہ اس کے ذریعے کائنات میں مختلف امور سرانجام دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہر اس شے کا علم عطا فرمایا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہیں جانتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''اور سکھا دیا تمہیں جو تو نہیں جانتا تھا'' (القرآن) اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد اگر کسی ہستی کا مرتبہ علیٰ و اَرفع ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ یوں دعا کرتے ہیں کہ ''یارب العالمین میرے علم میں اضافہ فرما''، تعلیم کی اہمیت ہر دور میں مسلمہ رہی ہے۔

حدیث نبوی میں ہے کہ:

''علم حاصل کرو گود سے لے کر گور تک'' (الحدیث)

''علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے'' (الحدیث)

''ایک عالم ہزار عابد سے بہتر ہے'' (الحدیث)

''طالب علم کے پاؤں کے نیچے فرشتے پر بچھاتے ہیں'' (الحدیث)

تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود فرمایا کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ قرآن پاک میں تعلیم کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''پڑھے لکھے اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔''

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محو گفتگو ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوتے ہیں عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو آپ کے پاس کھڑا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس کی موت کا وقت قریب آ چکا ہے اور فلاں وقت اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات متعلقہ شخص کو پہنچا دی۔ اُس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت میں کیا کروں جو دنیا و آخرت میں میرے لیے سود مند ثابت ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جتنا مال گھر میں ہے تمام صدقہ کر دو، وضو کر کے فوراً نفل پڑھنا شروع کر دے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علم حاصل کرو، تعلیم حاصل کرنے کا بندوبست کرو معلوم یہ ہوا کہ حصول تعلیم کی غرض سے وقت صرف کرنا دین و دنیا اور آخرت کیلئے بہتر ہے۔

انسانی زندگی کا اصل مقصد شخصیّت کی تعمیر و ترقی ہے کیونکہ اسی سے کردار تشکیل پاتا ہے جو انسانیت کی معراج ہے، تعمیر شخصیّت اور تعمیر و کردار میں سب سے اہم و بنیادی حصہ علم کا ہے۔ اسی لیے ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر دور میں انسان نے علم کی ضرورت کو محسوس کیا ہے اور اس کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھی ہیں۔ انسان کا کوئی فکر، کوئی نظریہ، کوئی عقیدہ اور کوئی عمل یا فعل صحیح اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنیاد علم نہ ہو۔

جس تعلیمی نظام کی بنیاد حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد میں رکھی گئی اس پر خلفائے راشدین کے عہد میں عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی، مذکورہ علوم کے علاوہ فقہی مسائل، اخلاقی اشعار اور امثال عرب بھی خبر و نصاب بن گئے، معلمین کی تنخواہیں مقرر کی گئیں اور علم و حکمت کی اشاعت کے لیے باقاعدہ انتظامات کیے گئے۔ اس طرح ہر گاؤں اور ہر بستی علم کی روشنی سے منور ہوتی چلی گئی،

خلافت راشدہ کے بعد اسلامی سلطنت کو بہت وسعت حاصل ہوئی اور نئے مسائل پیدا ہوئے تو اسلامی علوم کو بھی وسعت ملی۔ مسلمان مفکرین نے نئے نئے فلسفوں کی داغ بیل ڈالی اور علوم کا نئے انداز سے مطالعہ کیا۔ یوں مشرق سے مغرب تک ہر جگہ اسلامی علوم وفنون اور مسلم فکر ونظر کا چرچا ہونے لگا۔ مدینہ، کوفہ، بصرہ، بغداد، غرناطہ، قرطبہ، نیشاپور، سمرقند اور دہلی وملتان علم وحکمت کی آماجگاہ بن گئے۔ آج جو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترویج وترقی کے حسین مناظر نظر آرہے ہیں وہ تعلیم ہی کے مرہونِ منت ہیں۔

استاد کی عظمت

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو تخلیق فرمایا پھر اس کی تزئین وآرائش کے لیے اس میں پہاڑوں ، گلستانوں، میدانوں ، سمندروں ، ندیوں اور نالوں کو وجود بخشا، آبشاروں کی کھڑ کھڑاہٹ پیدا فرمائی، فضاؤں کی سرسراہٹ سے اس کے حسن میں چار چاند لگائے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے مختلف اوقات میں مختلف زبانوں میں مختلف قوموں میں مختلف انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ نبی آخر النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور پھر نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا اور کام علماء کرام کے سپرد ہوا اور علماء کرام میں اساتذہ جو مدرس ہونے کے ناطے عظیم منصب پر فائز ہوتے ہیں انھوں نے اس فریضہ کو بڑے احسن طریقے سے سرانجام دینا شروع کر دیا اور عوام النّاس کی اصلاح کے لیے مستعد رہے۔

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

اگر بنظر غائر مشاہدہ کیا جائے تو استاد کی حیثیت، اہمیت اور مقام مسلم ہے، کیونکہ استاد ہی نونہالانِ قوم کی تعلیم وتربیت کا ضامن ہوتا ہے، استاد ہی قوم کے نوجوانوں کو علوم وفنون سے آراستہ و پیراستہ کرتا اور اس قابل بناتا ہے کہ وہ ملک وقوم کی گرانبار ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ استاد جہاں نوجوانوں کی اخلاقی وروحانی تربیت کرتا ہے وہاں وہ اُن کی مختلف علمی، سائنسی، فنی، اور پیشہ ورانہ مہارتوں کا سامان بھی کرتا ہے، والدین بچے کی جسمانی پرورش کرتے ہیں، جبکہ استاد کے ذمے بچے کی روحانی تربیت ہوتی ہے، اس لحاظ سے استاد کی حیثیت اور اہمیت والدین سے کسی طرح کم

نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ان سے بڑھ کر ہے، کیونکہ روح کو جسم پر فوقیت حاصل ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ " انما بعثت معلما" بے شک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھر ایک اور مقام پر ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے انسان کے تین باپ ہیں، والد، سسر اور استاد۔ اسی طرح یوں ارشاد فرمایا کہ ہر طالب علم اگر کہیں خوشامد کسی کی کرسکتا ہے تو صرف استاد کی کرسکتا ہے کسی اور کی خوشامد جائز نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھے ایک لفظ سکھاتا ہے وہ میرا استاد ہے اور میں اس کا احترام کرتا ہوں، اور پھر فرمایا کہ ہم خدا کی اس تقسیم سے راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم دیا اور جاہلوں کو دولت دی کیونکہ دولت عنقریب فنا ہو جائے گی اور علم لازوال ہے۔

استاد کے احترام سے منازل قریب ہو جاتی ہیں، احترام استاد سے روحانی طراوت نصیب ہوتی ہے۔ استاد کے احترام سے اپنی عظمت اور عزت میں اضافہ ہوتا ہے جنہوں نے استاد اور اپنے معلم کا احترام کیا اللہ تعالیٰ نے اس کے نصیب کو بلند و بالا کر دیا، اس کو مقام ارفع پر متمکن کر دیا۔

سکندرِ اعظم نے بڑا نام پا کر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی، اس نے تقریباً آدھی دنیا کو فتح کیا اس میں اس کے استاد ارسطو کی نظر شفقت شامل حال تھی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، ابن سینا رحمۃ اللہ علیہ، بوعلی سینا رحمۃ اللہ علیہ، ادریسی رحمۃ اللہ علیہ، نفیسی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہنے ایسی ایسی عظمتیں اور رفعتیں حاصل کیں ان سب کو اعلیٰ مقامات اور مناصب پر فائز کرنے میں کسی نہ کسی استاد کا ہاتھ تھا۔

کائنات رنگ و بو میں جو رنگینیاں نظر آرہی ہیں، جو لہلہاتے ہوئے کھیت اس کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں، جو سمندر کی خاموشی اور دریاؤں کی روانی منظر پیش کر رہی ہے، جو بلند و بالا پہاڑ دکھائی دے رہے ہیں، جو طویل القامت شجر مظاہرہ حسن و جمال پیش کر رہے ہیں کسی نہ کسی استاد کے مرہونِ منت ہیں۔ حُسنِ کائنات میں اضافے کے لئے اور عروسِ کائنات کے گیسوؤں میں مشاطگی کے لئے کسی نہ کسی معلم اور استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

استاد روحانی باپ ہوتا ہے یہ زمین سے اُٹھا کر آسمان تک لے جاتا ہے، بلندی پرواز کا تصور بخشتا ہے، اندھیرے سے روشنی میں لے جاتا ہے، جہالت سے نکال کر علم کی دادیوں کی

سیر کرواتا ہے، جھوٹ کی وادی سے اُٹھا کر صدق کی بلندیوں پر فائز کرتا ہے، استاد کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اُٹھا کر چمنستان و گلستان کی وادیوں میں سیاحت کرواتا ہے، استاد گدھوں کی دنیا سے نکال کر عقاب وشاہین کی ہمراہی کے ڈھنگ سکھاتا ہے، استاد ہی کی وجہ سے زندگی کی جملہ آسائشیں میسر ہیں اور آخرت میں کامیابی استاد ہی کی وجہ سے ہے تو پھر کیوں نہ استاد کی عظمت کو سلام کیا جائے اور دل وجان سے اس کا احترام کیا جائے۔

مایوسی گناہ ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور پھر اس کے سر پر عظمت کا تاج سجایا۔ اس کو دیگر مخلوقات پر فوقیت دی، اس کی عظمت کا راز اس کی عقل سلیم میں رکھا کیونکہ دیگر مخلوقات میں شرف و بزرگی کا عنقاء عدم عقل وخرد ہے، اور پھر اُس کو صحیح اور غلط کی پہچان نصیب فرمائی۔ اور اُس کی رفعت کے حصول کے لیے کوشش کو محمود گردانا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرے۔''

اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور تگ و دو اور شبانہ روز کوشش سے دست کش ہو جائے مایوسی کے ظلمت کدہ کا مکیں بن جائے، نا امیدی کے عفریت کے جبڑوں میں پھنس جائے تو پھر بلیّات ومصائب کے مہیّب سائے تو اُس کے آنگن میں آسکتے ہیں، خوش بختی اور خوش نصیبی کے آفتاب کی کرنوں سے اس کا گھر محروم رہے گا۔

مایوسی ویسے گناہ ہے۔ نا امیدی کے سائے کے نیچے پروان چڑھنے والا پودا کبھی شجر سایہ دار نہیں بن سکتا۔ نا امیدی کے گلستان میں کھلنے والے گلہائے رنگا رنگ خوشبو کی راحت افزاء مہک سے عاری ہوتے ہیں، مایوسی کے خار ہائے نوک دار پر پا پیادہ شخص آبلہ پائی کا شکار ہوسکتا ہے ہریرو پرنیاں اور مخمل کا احساس اُس سے کوسوں دور ہوتا ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ''! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید مت ہوں۔ بحیثیت مسلمان تو نا امیدی ویسے بھی گناہ اور حرام ہے۔ انسان جب امید سے اپنے دامن کو پر رکھتا ہے تو مسرتیں اور راحتیں اس کے دروازے پر

دستک دیتی رہتی ہیں۔اور امید ہی کی کرن اس کو حیات نو بخشتی ہے۔

کسان اور دہقان کی امید اس کے کھیت اور کھلیان ہوتے ہیں اور انہی کے سہارے وہ اپنے ایّام زیست گزارتا ہے، معلم اور مدرس کی امید اس کے طلباء ہوتے ہیں، ان کی کامیابی کی امید کے سہارے اس کے لمحاتِ نفسی کو سکون اور اطمینان میسّر آتا ہے۔ایک اچھا منتظم اسی اُمید کے سہارے خوش رہتا ہے کہ اس کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے افراد اس سے مطمئن ہیں اور اس کی مینجمنٹ تسلی بخش ہے۔

امید ہی کے سہارے دنیا قائم ہے، جیسے ہی اولادِ نرینہ جیسی نعمت سے کوئی مالا مال ہوا تو فوراً ہی امیدیں بندھنا شروع ہوگئیں کہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا، اس کو ایک اعلیٰ اور عظیم انسان بنایا جائے گا۔اس کی تربیّت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا، اس کی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے ہر قسم کی کاوش کی جائے گی۔لیکن بحیثیت مسلمان ہم اسی بات کے پابند ہیں کہ کوشش کریں لیکن انجام اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں نتیجہ خدائے وحدہٗ لاشریک پر چھوڑ دیں۔بھروسہ اسی پر رکھیں۔کیونکہ اس کی رحمت کے طفیل ہی امیدیں بر آتی ہیں۔اس کی رحمت کے صدقے مایوسی ختم ہو جاتی ہے۔

رحمتِ حق بہانہ مے جوئید

اس وقت اگر ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہونا چاہتے ہیں، عظمتوں اور نعمتوں کی منازل طے کرنا چاہتے ہیں، امن وسکون کی فاختاؤں کو اپنے گھر کی منڈیر پر بٹھانا چاہتے ہیں تو امید کے آفتاب کی روشنی سے اپنے ظلمت کدۂ خالی کو منور و مستنیر کرنا ہوگا۔اور دل و جان سے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مایوسی گناہ ہے۔

کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا
مایُوس تو نہیں ہیں طُلوعِ سحر سے ہم

☆☆☆☆☆☆☆

علم کے فائدے

علم نور ہے جہالت تاریکی ہے۔علم کی شعائیں جہاں پہنچتی ہیں جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اپنا وجود ختم کر بیٹھتے ہیں۔قصر جہالت ولاعلمی کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں،خزاں رسیدہ دل و دماغ بہار آشنا ہوتے ہیں۔علم کے زیور سے مرصّع ومزیّن انسان عزّت وعظمت کے قصر رفیع میں مکین ہوتا ہے،معرفت وآگہی کا تاج سر پر سجائے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے کمر بستہ رہتا ہے،علم وآگہی کے نشتر سے معاشرے میں موجو ظلم و بربریّت کے ناسور کے متعفن مادے کے اخراج میں اہم کردار ادا کرتا ہے وہ کشور علم ودانش کا شہنشاہ اور اقلیم روحانیت کا تاجدار ہوتا ہے۔

علم انسان کو انسانیّت کی معراج پر فائز کرتا ہے،تاریخ شاہد ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جو مقام ومرتبہ اہل علم کو نصیب ہوا ہے وہ کسی اور کو نہیں ملا،علم ہی کی بدوت ہم نے فضاؤں کو مسخر کیا ہے،علم ہی کے ذریعے ہم نے ہواؤں میں پروازیں کی ہیں،علم ہی کے سبب ہم نے جبال شامخہ کی سینہ شگافی کی ہے،علم ہی کی وجہ سے ہم نے اپنے کھیتوں اور کھلیانوں کو کشتِ زعفران بنایا ہے،علم کی تیغ سے غفلت ولاپرواہی کی جڑ کاٹی ہے،علم کی شمع سے اندھیروں کو اجالا بخشا۔علم نے ہمیں سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کا سلیقہ عطا کیا،اسی علم ہی کی بدولت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شناخت نصیب ہوئی۔

علم ہے میراث مومن کی ، اسے حاصل تو کر

علم ہے درمان راشدؔ اور جہالت اک مرض

اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اس کے علاوہ دنیا کی ہر شے مخلوق ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، اور اس جملہ کائنات میں افضل و اعلیٰ اور بزرگ و برتر جو ہستی ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل ہر مخلص مسلمان کا فرض اولین ہے، اور دین و دنیا میں کامیابی کا سبب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم عطا فرمایا تھا لیکن اس کے علی الرغم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیشہ "رب زدنی علما" کی صدا بلند کرتے تھے، علم میں اضافے کے لیے کوشاں رہتے تھے، بحیثیت مسلمان علم میں اضافے کے لیے جہد مسلسل، پیہم تگ و دو، اور انتھک جدوجہد نہ صرف دنیوی کامیابی کا سبب ہے بلکہ خوشنودی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلما و رضائے الٰہی کا موجب بھی بنتی ہے۔

اہل علم آسمان علم و دانش پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اہل علم کے درجات کو بلند فرمایا ہے۔ اہل علم کھیل کے میدان میں ہو تو عظیم کھلاڑی ثابت ہوگا، صاحب بصیرت طبیب علاج گاہ میں طبی فرائض سرانجام دے رہا ہو تو وہ اچھا مسیحا ثابت ہوگا، صاحب علم و آگہی گھر کی چار دیواری میں ہوگا تو در و دیوار اس پر ناز کریں گے۔ اس کے وجود کی برکات سے گھر میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول ہوگا۔ تمام اہل خانہ اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ اہلِ علم ادارے میں ہوگا تو اس کی بدولت ادارے کا نظم و نسق اعلیٰ و ارفع ہوگا۔ اس کے اثرات نونہالان چمن اور اطفال مکتب پر مثبت پڑیں گے، اہل علم کی حیثیت گویا عطر فروش کی طرح ہے اسی سے اگر عطر نہ بھی خریدا جائے تو پھر بھی وہ اپنی عطر بیز فضاء سے ماحول کو اور قرب و جوار کو ضرور معطر کر دے گا، اسی طرح اہل علم سے کوئی چیز نہ بھی سیکھی جائے پھر بھی اس کی نشست و برخاست میں کوئی نہ کوئی درس ہوگا۔ اس کی گفت و شنید اور دید بھی ناظرین کے لیے کوئی نہ کوئی تعلیمی مواد فراہم کر دے گی۔

علم کو علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے سینے سے لگایا اللہ تعالیٰ نے داتا گنج بخش بنا دیا، علم کی چوکھٹ پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے سر رکھا تو اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت بنا دیا، گلستان علم و ادب سے محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے گل چینی کی تو اللہ تعالیٰ نے قائداعظم بنا دیا، مجدد الف ثانی

رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ، سید جمال الدین افغانی رحمتہ اللہ علیہ، ابن خلدون، ڈپٹی نذیر احمد نے دریا علم و معرفت کی دریوزہ گری کی تو اللہ تعالیٰ نے اقلیم علم و دانش کا شہنشاہ بنا دیا۔

علم کا تاج سر پر سجاتے رہو
نام راشدؔ جہاں میں کماتے رہو

☆☆☆☆☆☆☆

سانچ کو آنچ نہیں

مالا لکڑ، ٹھاکر پتھر، گنگا جمنا پانی
جب تک دل میں سانچ نہ آوے چاروں وید کہانی

''سانچ کو آنچ نہیں'' کا مطلب ہے کہ سچائی میں برکت ہے، سچ بولنے والا خواہ مرد ہو، سچ بولنے والی عورت ہو، سچ بولنے والا بڑا ہو، صداقت اجتماعی صورت میں ہو یا انفرادی طور پر ہو ہمیشہ ایک مسلم معاشرے میں مستحسن گردانی جاتی ہے، سچ بولنے والے افراد معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ سچ سے روگردانی کرنے والے اور کذب بیانی کے عادی افراد ایک صحت مند معاشرے کے قیام میں نہ صرف سدِ سکندری ثابت ہوتے ہیں بلکہ ان کا وجود بے سود اقوام میں ناسور کی شکل میں متشکل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب لاریب میں ارشاد فرمایا ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں (صادقین) کے ساتھ ہو جاؤ''، اس سے یہ بات مترشّح ہو رہی ہے کہ صداقت اور سچائی ایک ایسی عظیم صفت ہے جس سے متصف مقدس ہستیوں کی معیت کا حکم جو خود خدائے لم یزل دے رہا ہے۔

جن کے سر پر سایۂ صِدق و صفا ہو جائے گا
راشدؔ راضی آپ ہی ان سے خدا ہو جائے گا

اوراق تاریخ کی ورق گردانی کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جن لوگوں نے صداقت اور سچائی کا دامن تھامے رکھا وہ میدانِ راست بازی کے شاہسوار بنے۔ دروغ گو، ملعونین اور کاذبین، صادقین کے گھوڑے کے سُموں سے اڑنے والی دھول کو بھی نہ

پہنچ سکے، سینے پر صداقت کا تمغہ اور سر پر راست بازی کا تاج رکھنے والے افراد ہی آسمانِ علم و دانش پر آفتاب نصف النہار کی طرح چمکتے ہیں۔

صداقت ایک ایسا وصف ہے کہ جس نے اس زیور سے اپنے آپ کو مزیّن و مرصّع کیا دین و دنیا میں کامیاب و کامران ہو گیا۔ ایک عام آدمی نے صدق کا دامن تھاما وہ معاشرے کا اہم فرد بن گیا، ایک امام و خطیب نے صداقت اور سچائی سے وابستگی کو دوام بخشا تو وہ تادیر مسندِ امام و خطابت پر متمکن رہا، جس قاضی و منصف نے عدل و انصاف کی نشست پر براجمان ہو کر آفتابِ حق و صداقت کی نور بخش کرنوں سے اپنے فیصلوں کو جلا بخشی اس کا نام تادیر زندہ رہا۔ صاحب اتّقاء، سلف صالحین، نابغۂ روزگار ہستیاں ابدال، قطب، ولی، غوث، صحابیّت کے درجے پر فائز افراد بامراد، ان تمام افراد میں حق و صداقت کی قدر مشترک ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث پاک ہے کہ:

الصدق ینجی والکذب یھلك

سچ نجات دیتا ہے اور جھوٹ ہلاک کر دیتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مذکورہ حدیث پاک سے کسی بھی طرح ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ فرمان کسی خاص طبقہ یا کسی خاص فیلڈ کے لیے ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان جملہ بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا مسلمان جھوٹ بول سکتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان سے دیگر گناہوں کے ارتکاب کا امکان تو ہے لیکن مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اسی طرح ایک اور فرمانِ عالیشان بھی ہے کہ سچ نہ بولنا نفاق کی علامت ہے۔ یعنی منافقت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حق و صداقت اور راست بازی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ ہمارے معاشرتی معیار کا گراف جو گر رہا ہے اس کا سبب فرمانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دوری ہے۔ ہماری حکومت کا یہ اقدام قابلِ صد مبارک ہے کہ وہ طلباء کے ذہنوں میں گلشن حق و صداقت کے تناور درختوں کو مزید پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے اور

جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی اور دروغ گوئی کے خس وخاشاک کو جڑ سے اکھاڑ نا چاہتی ہے، ہمیں دنیاوی واخروی کامیابی کے لیے حق وصداقت کا دامن تھامنا ہوگا اسی میں ابدی فلاح ہے۔ یہ سچ ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں۔

سبق پڑھ پھر صداقت کا، شجاعت کا ، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اسلام رواداری کا علمبردار

اسلام کی رحمت وشفقت کا دائرہ کسی خاص قوم وملت کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ کار پورے عالم انسانیت تک پھیلا ہوا ہے۔ اسلام نے تمام مخلوق کے ساتھ نیکی، احسان اور بھلائی کا حکم دیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اس کے نزدیک سب سے پسندیدہ مخلوق ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ نیکی کرے۔'' (طبرانی وبیہقی)

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کُنبہ خدا کا

''جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا بھی رحم نہیں کرتا۔'' (ترمذی)

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

مذکورہ بالا احادیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ اسلام رواداری کا علمبردار ہے۔ وہ ہر ایک کو برابری کی سطح پر دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک اور مقام پر بھی کچھ اس طرح کا فرمان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی نظر میں تمام برابر ہیں'' اسلام میں یہ نہیں ہے کہ جو صرف مسلمان پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ بھی رحم نہیں کرتا، بلکہ حکم ہے جو لوگوں میں رحم، شفقت ومحبت کے جذبات کو پروان نہیں چڑھاتا وہ خدائے لم یزل کی بے پایاں شفقتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسلام میں کسی کی تخصیص نہیں کی گئی۔ یہودی ہو، عیسائی ہو، مجوسی ہو، آتش پرست ہو یا زرتشت ہو انسان ہونے کے ناطے سب برابر ہیں۔ اسی طرح ایک اور حدیث پاک

میں ہے کہ جنّت ماں کے قدموں کے نیچے ہے، یہاں یہ نہیں کہا کہ ماں مسلمان ہو، باوضو ہو کر جائے نماز پر بیٹھ کر تسبیح کرنے میں مصروف ہو، قرآن کا ابتدائی قاعدہ (یسرنا القرآن) نکال کر اپنی اولاد کو ہجے کروا رہی ہو، یا تلاوت کلام پاک مسحور کن آواز میں کر رہی ہو تو اس کے قدموں کے نیچے جنّت ہے، فرمایا کہ اگر مکہ کے بازار میں تجارت کرنے والے یہودیوں کی اہلیہ ہو، عیسائی مذہب کے پیروکار کی رفیقہ حیات ہو، آگ کی پوجا کرنے والی آتش پرست عورت ہو، یا مجوسی مذہب سے تعلق رکھنے والے شخص کی اولاد کی والدہ ہو ان سب ماؤں کے قدموں تلے جنت ہے۔

اسلام میں کسی مقام پر بحوالہ قرآن بھی یوں فرمایا گیا ہے ''بے شک اللہ تعالیٰ سب کے ساتھ عدل واحسان اور حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے'' یہاں پر بھی یہ نہیں کہا گیا کہ صرف مسلمان کے ساتھ عدل واحسان کرو، صرف متقی اور پرہیزگار کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آؤ بلکہ ہر ایک کے ساتھ احسان اور بھلائی کرو۔

ابتدا میں اسلام اور مسلمان کا سابقہ مشرکین عرب اور یہود ونصاریٰ کے ساتھ رہا۔ یہ تینوں مسلمانوں کے دشمن تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس کے علی الرغم اسلام نے ان کو انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا۔ دو مختلف اہل مذاہب کے مابین تعلق کا ایک بڑا ذریعہ ساتھ کھانا، پینا اور شادی بیاہ ہے، اسلام میں اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال اور ان کی مستورات سے شادی کرنا جائز ہے۔ (لیکن آج وہ اہل کتاب نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب میں تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے) عیسائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مہمان ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خود ان کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ایک مرتبہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی طرف سے ایک وفد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو مہمان بنایا اور بنفس نفیس خدمت سرانجام دی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اہل کتاب کو اپنی مسجد میں نماز تک ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرما دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ نجران کے عیسائیوں کا وفد جب مدینہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائیوں کی نماز کا وقت آ گیا۔ انہوں نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ مسلمانوں نے روکنا چاہا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو منع کر دیا اور فرمایا کہ نماز پڑھنے دو، چنانچہ انہوں نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ

وسلم میں اپنے مذہب کے مطابق مشرق کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھی۔ اسلام نے جورویّہ دوسرے ادیان کے متعلق اختیار کیا ہے اس کی بنیاد اس تعلیم پر ہے کہ صحیح دین ہمیشہ سے توحیدی رہا ہے اور ان تمام توحیدی ادیان کی بنیاد میں اخلاقی اقدار مشترک رہی ہیں۔

اسلام کا یہی رویّہ اور نظریہ تھا جس کے باعث مسلمان ملکوں میں سیاسی اختلاف کے باوجود غیر مسلم اقلیتیں اپنی انفرادی زندگی کو برقرار رکھ سکیں۔ عیسائی کلیسا سے ناقوس کی آواز اور متصلہ مسجد کی اذان بلند ہوتی تھی۔ ہسپانیہ میں تقریباً آٹھ صدی تک مسلمانوں کی حکومت رہی کسی نے بھی دباؤ یا جبر سے غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش نہ کی۔ ان کی حکمت عملی ہی کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہوئی تو غیر مسلم اکثریت نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور ان کی عطا کردہ ثقافتی و مذہبی آزادی کا بالکل پاس نہ کیا۔ وہ تہذیب وتمدن ،کلچر وثقافت جو مسلمانوں نے وہاں پیدا کیا اور جس کی ضیاء پاشیوں سے بعد میں تمام یورپ منور و مستفیض ہوا متعصّبانہ لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔

اسلام رواداری کا علمبردار ہے اس کی وضاحت برصغیر پاک و ہند کی اس بات سے کی جاسکتی ہے جب کسی سیاسی یا تبلیغی کوشش کے بغیر ہندو عوام برہمنوں کی ذات پات کی تقسیم کے شدید عملی مضرات سے تنگ آ کر مسلمان ہوتے رہے۔ انڈونیشیا میں بھی اسلام اس وقت پھیلا جب وہاں ہالینڈ کے عیسائی حکمران اپنے عقائد کی تبلیغ، سیاسی قوت اور سرمایہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کر رہے تھے یہودی لوگ اور بعد میں خود عیسائی سلطنتوں اور علاقوں میں ہمیشہ ظلم وستم کا تختہ مشق رہے ان کو اسلام کے بعد چین اور آرام کی زندگی میسر آ گئی۔

لارڈ ہیڈلے نے کہا کہ جب انہوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو ان کا ایک عزیز ترین دوست بشپ ان کے پاس آیا اور کہا: ''مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس تبدیلی مذہب سے تم جہنم واصل ہو جاؤ گے'' ہیڈلے نے جواب دیا مذہب کی یہی تنگ دلی اور تعصب ہے جس نے مجھے اس کو چھوڑ کر ایک دوسرے مذہب میں داخل ہونے پر مجبور کیا ہے تم کہتے ہو کہ چونکہ میں نے چند از عانات پر ایمان لانا ترک کر دیا ہے اس لیے میں جہنم میں جاؤں گا لیکن اسلام جس کو میں نے اختیار کیا ہے یہ اس قسم کی تنگ نظری اور متعصّبانہ رویّہ نہیں رکھتا۔ آج اسلام پر جو دہشت گرد مذہب ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے یہ سراسر غلط ہے وہ مذہب جس کی

پناہ میں دیگر مذاہب کے پیروکار آتے رہے اور سکون وراحت کے جام نوش کرتے رہے، امن و آشتی کی خلعتِ فاخرہ زیب تن کرتے رہے۔ محبت ومرّوت کا تاج سر پر سجاتے رہے اس پر دہشت گرد ہونے کا الزام لگانا بیمار ذہن کی عکاسی کرتا ہے اور موجودہ دور میں، افراتفری، بدامنی، انارکی، خلفشاری، کشت وخون، دنگا فساد، بربریت، ظلم واستبداد اسلام کے ابدی اور سرمدی اصولوں سے دوری کا نتیجہ ہے ورنہ اسلام رواداری کا علمبردار ہے۔

زندگی خدا کی نعمت ہے

اس کائنات رنگ وبو میں جہاں نظر دوڑائیں اُس منعم حقیقی کی عطا کردہ نعمتوں کی فراوانی ہی فراوانی ہے۔ کہیں کھیت وکھلیان کشتِ زعفران کا نمونہ پیش کررہے ہیں، کہیں گلستان ونخلستان جشنِ بہاراں کی آمد کی نوید جانفزا سُنا رہے ہیں، کہیں دریا اور نہریں جوئے نغمہ خواں کی صورت میں موجود ہیں، کہیں کوہستانی علاقوں میں موجود فلک بوس پہاڑ اور جبال شامخہ ناظرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں جو مختلف شکلوں میں موجود ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر جو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے وہ زیست ہے، وہ حیات ہے، وہ زندگی ہے۔

زندگی ہے تو سب نعمتیں رعنائیاں بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہیں، زندگی کے حیات بخش قطروں سے سیراب شخص ہی جملہ انعاماتِ ربّانی سے متمتع ہوسکتا ہے، زندہ شخص ہی بادِ نسیم کے مسحور کن جھونکوں سے مسرور ہوسکتا ہے، زندگی ہی گلہائے گلستان ونخلستان کی حسن وزیبائش کا احساس دلاسکتی ہے، زندگی سے حرکت ہے، زندگی سے برکت ہے، زندگی سے عبادت ہے، زندگی سے عیادت ہے۔ انسان کا وجود، قوم کا وجود، معاشرے کا وجود ملک وملت کا وجود زندگی کا ہی مرہونِ منت ہے۔

زندگی کی حقیقی رعنائیوں سے فائدہ اٹھانے والے ذی فہم فراست لوگ آسمان علم ودانش پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے ہیں، وہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتے کہ یہ زندگی ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے، ہم نے اس میں خیانت نہیں کرنی ہے، ہم نے اپنی زندگی کو اُسی راستے پر گامزن کرنا ہے جہاں خالق حقیقی کی منشاء ومراد ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''ہم نے انسان کو اور جن کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں'' پانی ایک عظیم نعمت ہے جو زندگی کے استحکام اور استمرار کے لیے جزو لاینفک ہے۔ یہی پانی اگر اپنی حدود و قیود میں رہے تو اللہ تعالیٰ کی برہان ہے اور اگر اپنی متعین کردہ حدود سے باہر آجائے تو طوفان بن جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی جس کی حدود کا تعین کر دیا گیا ہے اگر وہ اپنی حدود میں رہے تو یہ ایک نعمت ہے اور اگر حدود شکنی کرے تو زحمت بن جاتی ہے۔

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

زندگی چور کی بھی ہے، زندگی چوکیدار کی بھی ہے، زندگی قاتل کی بھی ہے، زندگی مسیحا کی بھی! زندگی بت فروش کی بھی ہے، زندگی بت شکن کی بھی! زندگی رقص و سرود میں محورہ کر رات گزارنے والے خواجہ سرا کی بھی ہے، زندگی شب بیدار، تہجد گزار پارسا و صالح انسان کی بھی! زندگی لوٹ مار کرنے والے اور غارتگری کرنے والے انسان نما حیوان کی بھی ہے، زندگی ظلماتِ شب میں سرحدوں کی حفاظت کرنے والے مجاہد بے ریا کی بھی ہے، زندگی فلک کی رفعتوں کو پانے والے شاہین کی بھی ہے اور مردار کے گرد منڈلانے والی گدھوں کی بھی!

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ زندگی کی حفاظت ایمان کا حصہ ہے۔ خودکشی جہاں دیگر ادیان میں قابل نفرین ہے وہاں اسلام بھی اس کی سختی سے مذمت کرتا ہے، خودکشی گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتی ہے۔ قاتل کی سزا سخت ہے، قتل کے بدلے قتل کرنے کا حکم ہے۔ کسی کی زندگی ختم ہوتی نظر آئے، کوئی شخص نابینا ہو اور کنویں میں گر رہا ہو یا آگ میں جلنے والا ہو تو نماز جیسی اہم عبادت کے بارے میں حکم ہے کہ نمازی اپنی نماز توڑ دے اور اس کی زندگی کو بچالے۔ بلکہ ایک حدیث پاک میں زندگی کی اہمیت کچھ اس انداز سے اجاگر کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کعبہ شریف کی عمارت میں کسی وجہ سے پھنس جائے تو کعبہ کی دیوار کو توڑ کر بھی اس کی جان بچائی جائے، متعدد روایات سے زندگی کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

زندگی کی بوقلمونیوں سے وہی شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو اس کی حقیقت سے آشنا ہو اور اس کی حقیقت سے آشنائی دینِ اسلام کی پیروی اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں مضمر ہے۔

رب کا شکر نصیب ہو تو اک نعمت ہے
راشدؔ ناشکری میں اپنی ذلت ہے

اتفاق میں برکت

ریت کے ذرات مل کر ریگستان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں مٹی کے ذرات اکٹھے ہو کر گارے کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں، پانی اور مٹی کا یہ امتزاج اینٹوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اینٹیں آپس میں مل جل کر فلک بوس عمارت کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔ ستارے آپس میں گھل مل جائیں تو کہکشائیں وجود میں آجاتی ہیں۔ افراد مل کر رہنا شروع کر دیں تو گھر، کوچہ، قریہ، محلّہ اور بڑی بڑی آبادیوں کا وجود منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

نظامِ قدرت کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں اور چشم بنیا سلسلہ مشاہدہ وا کریں تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ باہم مربوط اور متحد نظر آتا ہے۔ تمام برکات جو دنیا مافیہا میں نظر آرہی ہیں یہ باہمی اتحاد و تعاون کا ثمر ہے۔

پانی کے قطرے مل کر ندی نالوں، بحیروں اور بڑے بڑے سمندروں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں تو کائنات میں بسنے والے انسان اور بالخصوص مسلمان شعوری طور پر باہم متحد کیوں نہیں ہو سکتے، یقیناً ہو سکتے ہیں۔ آج اگر تقریباً 57 ممالک مسلم ممالک ہیں اگر یہ تعصب، نرگسیت اور فرقہ واریت کے بتوں کو پاش پاش کر کے اکٹھے ہو جائیں تو تمام لادینی قوتوں کے عفریت قاتل کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں اور اسلام کی قوتِ لازوال کا عملی مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ متفق اور متحد رہنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اختلاف سے تو ایسی دراڑیں پڑتی ہیں کہ معاشرے کا وجود باقی رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اتفاق اور اتحاد جملہ معاملات میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

صراط مستقیم

ہم جب نماز ادکرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔فرض ادا کرنے ہوں، وتر ادا کرنے ہوں، نفل ادا کرنے ہوں، واجب کی ادائیگی ہورہی ہے یا سنن ادا کرنے کی غرض سے حالت قیام میں سجدہ کی جگہ پر نظر جما کر محوعبادت ہوں۔ ہر حال میں اور ہر رکعت میں باہوش وحواس اہدنا الصراط المستقیم کی تکرار کرتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اے اللہ ہمیں سیدھے رستے کی طرف ہدایت فرما'' پابند صوم وصلوۃ شخص دن میں اڑتالیس مرتبہ بہ صدائے عجز و نیاز بلند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرتا ہے، ہر کلمہ گو شخص خواہ رنگ میں، نسل میں، نسب میں، حسب میں اختلاف ہی کیوں نہ رکھتا ہو طلب راہ راست میں برابر ہوتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ یہ اپنے ماننے والے کے لیے ہر میدان میں ترقی وعروج کے دروازے وا کر دیتا ہے۔اس کی تعلیمات پر عمل پیرا شخص صحت مند معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ سے دست سوال دراز کرنے والا شخص دراز قامت ہو، کثیر الوجود ہو، کثیر العیال ہو، انعام وکرام سے نواز دیا جائے اور کوتاہ قد، نحیف، اور قلیل العیال شخص بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہو اور وہ نامراد واپس لوٹ آئے۔اللہ تعالیٰ کی رحمت، نعمت اور انعام وکرام کے دروازے ہر ایک کے لئے ہیں۔

لیکن حصول رحمت ایزدی کے لیے سلیقہ مند ہونا انتہائی ناگزیر ہے اور سلیقہ بجز حُبِّ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اطاعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اطاعتِ الٰہی ہے ''جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ

تعالیٰ کی اطاعت کی‘‘ مناصبِ جلیلہ پر فائز ہونے کے لیے حُبِّ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنانا ہوگا، زبانی دعوؤں کو خیر باد کہہ کر عملی زندگی کی طرف قدم بڑھانا ہوگا۔ دوران عبادت تو طلب صراطِ مستقیم کی ہو عملی زندگی میں اور دنیاوی امور کی انجام دہی کے دوران متضاد رویے اختیار کئے جائیں۔ یہ ایک انسان اور بالخصوص مسلمان کو زیب نہیں دیتے۔ صراطِ مستقیم پر چل کر ہی دین و دنیا کو سنوارا جا سکتا ہے۔

خود شناسی خدا شناسی ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جو پیدا فرمائی ہے اس کی ایک شناخت ہے، سورج کی ایک شناخت ہے کہ وہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ ستارے رات کو چمک کر شب دیجور کے لیے ضیا کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اور مسافرانِ شب کے لیے خضر راہ بنتے ہیں تو یہ ستاروں کی ایک شناخت ہے، فلک بوس پہاڑ اور جبال شامخہ کا ایک طویل سلسلہ بھی اپنی شناخت رکھتا ہے۔ الغرض دنیا و مافیہا ہر چیز اپنی شناخت رکھتی ہے۔ جس کے باعث اس کا وجود قائم ہے۔

انسان کی بھی ایک شناخت ہے کہ وہ حیوان ناطق ہے اور ذوی العقول ہے، اس کی چال ڈھال، اس کی نشست و برخاست، اس کا قیام و قعود، اس کی گفت و شنید اس کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، اور پھر قرآن پاک اس کو اشرف المخلوقات کا لقب عطا فرما کر انسانیت کی معراج پر متمکن بنا دیتا ہے، اس سے بڑھ کر مسلمان جو اسلام کے زیور سے مرصّع ہے، جس نے دینِ اسلام کا تاج اپنے سر پر سجایا ہوا ہے، جس نے عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خلعتِ فاخرہ زیب تن کی ہوئی ہے اس کی بھی ایک شناخت ہے، اور وہ یہ کہ ارشادِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے ’’مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں‘‘ یعنی اسلام کے دعویدار تو بے شمار ہیں لیکن دینِ اسلام کے احکام پر عمل پیرا حقیقت میں وہی ہے جو مذکورہ حدیث پاک کے مطابق اپنی شناخت رکھتا ہے۔

کرسی عدالت پر بیٹھ کر فیصلہ سنانے والے منصف کی ایک شناخت ہے۔ شفا خانوں میں موجود مریضوں کے علاج کرنے والا مسیحا کی ایک شناخت ہے، سرحدوں پر مامور محافظ مجاہد کی ایک شناخت ہے، فضاؤں میں محو پرواز ہوا باز کی ایک شناخت ہے، گلستان رنگ و بو میں

موجود گلہائے رنگارنگ کی ایک شناخت ہے، کھیت وکھلیان کو کشتِ زعفران بنانے والے انتھک کسان کی ایک شناخت ہے، منبر رسول پر بیٹھ کر وعظ ونصیحت کرنے والے واعظ خوش الحان کی ایک شناخت ہے، مدارس کے اندر تعلیم قرآن دینے والے قاری کی ایک شناخت ہے، پوری دنیا کا ہر ذرّہ تو اپنی شناخت رکھے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ مخلوق کی شناخت اور پہچان ہو اور خالق کی کوئی معرفت اور پہچان نہ ہو۔

خداشناسی کیسے ہو اس کے لیے ہمارے پاس دو بنیادی مآخذ ہیں جس کے تمام ارباب علم ودانش معترف ہیں۔ مآخذ اوّل قرآنِ پاک ہے جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''کہ انسان اور جن کو صرف اس لیے پیدا فرمایا کہ وہ میری عبادت (معرفت) کریں''۔ معرفت کے لفظ کو اس لیے قوسین میں درج کیا ہے کہ مشاہیر مفسرین نے اس سے مراد معرفت اور پہچان لی ہے، اور قرآنِ پاک میں ایک اور مقام پر آتا ہے ''کہ تم اپنے آپ کو نہیں دیکھتے'' یعنی اگر خداشناسی کی خواہش تمہارے اندر انگڑائیاں لے رہی ہے تو اپنا مشاہدہ کرو اپنی شناخت کرو اللہ کی پہچان حاصل ہو جائے گی۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ:۔''ہم تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں'' ان فرمودات سے یہ بات مترشّح ہو رہی ہے کہ خداشناسی کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، اگرچہ یہ تمام مظاہر فطرت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دال ہیں لیکن انسان کا اپنا وجود ہی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان کے لیے کافی ہے۔

حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ '' من عرف نفسہ فقد عرف ربہ '' جس نے اپنی پہچان حاصل کر لی اس نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لی'' انسان کے اعضاء اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ کوئی تو ہے جس نے آنکھ بنائی، جس نے دل بنایا، جس نے دماغ بنایا، جس نے جسم انسانی بنایا وہ ذات وحدہٗ لاشریک خدائے لم یزل ہے۔ اور یہی خداشناسی ہے جو خودشناسی سے حاصل ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لی، خداشناسی کے عظیم منصب پر فائز ہو گئے اور اپنی روح کی تازگی کا سامان میسر ہو گیا تو وہ آسمان علم ودانش پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، وہ میدانِ

شعور وآگہی کے شاہسوار بن گئے، وہ گلشنِ معرفت وآگہی کے گلہائے رنگارنگ بن گئے، دنیا کے بادشاہوں نے ان کے در کی دریوزہ گری کی، خوش بختی کے ہمانے ان کے قصرِ رفیعہ سے گزرنا اپنے لیے سعادت سمجھا۔ خودشناس انسان اصل میں خداشناس ہے اور ''خودشناسی ہی خداشناسی ہے''

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے

والدین کا مقام

رشتے ناتے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، رشتے مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں کسی کے ساتھ رشتہ ناطہ موروثی نوعیت کا ہوتا ہے، کسی کے ساتھ رشتہ اور تعلق علاقائی نوعیت کا ہوتا ہے کسی کے ساتھ خاندانی تعلقات ہوتے ہیں لیکن ان تمام رشتوں میں سب سے بڑھ کر رشتہ والدین کا ہے۔ یہ ایک عظیم رشتہ ہے کہ اس کا نعم البدل نہیں ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کروان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ، قرآنِ پاک سے جو بات ثابت ہوجائے پھر اس میں لیت ولعل کی گنجائش نہیں رہ جاتی اس پر عمل کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے، حکم عدولی کی صورت میں دین ودنیا دونوں برباد ہونے کا خدشہ ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں فرمایا کہ اگر تمہارے والدین میں سے کوئی ایک عمر رسیدہ ہوجائے تو ان کو اُف تک نہ کہو بلکہ ان کے ساتھ گفتگو کرنی ہے تو احسن طریقے سے کرو۔ اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ اگر کسی شخص کا خیال ہو اور وہ اس سوچ میں مستغرق ہو کہ آیا اس وقت وہ خالقِ کائنات، وہ مالک کائنات، وہ رازق کائنات، وہ پتھر کے اندر چیونٹے کو رزق دینے والا میرے ساتھ ناراض ہے ناخوش ہے تو وہ والدین کے چہرے کو دیکھ لے اگر والدین کے چہرے پر بشاشت ہے مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہیں تو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہے اور مسکراہٹ نہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور رضامندی والدین کے چہرے کو محبت سے دیکھنے میں ایک مقبول حج کا ثواب ملتا ہے۔

والدین کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی پیمائش کے لیے آج تک کوئی پیمانہ وجود میں نہیں آیا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے

جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ حق تیری ماں کا ہے، تین مرتبہ یہی ارشاد فرمایا چوتھی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تیرے باپ کا۔ ماں کے بارے میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے یعنی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے کہ ''جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے'' ماں کا مرتبہ بلند ہے، ماں ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، ماں آنکھوں کو طراوت بخشتی ہے۔ ماں دل کو سکون بخشتی ہے، روح کو تازگی بخشتی ہے، قلب کو اطمینان کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ ہمیشہ اولاد کے لیے اس کے ہاتھ بغرض دعا بلند رہتے ہیں۔ شیر خوارگی سے لے کر تادمِ حیات اگر باحیات ہو تو خیر سگالی کے جذبات سے اس کا دل معمور رہتا ہے۔

یُوں دیا اوقات سے بڑھ کر خدا سے مل گیا
جو نہ ملنا تھا مجھے ماں کی دُعا سے مل گیا

کائنات کی تمام رنگینیاں ملک کے اندر پھیلے ہوئے دریا، ندی نالے، سمندر، لہلہاتے ہوئے کھیت، اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بادِ نسیم، فلک بوس پہاڑ، فضاء میں محو پرواز طائران خوش الحان گلہائے رنگ کشتِ زعفران بنے ہوئے کھیت، مؤذن کی اذان، مجاہد کی شب بیداری، پھول کی مہک، جگنو کی چمک، سورج کی تپش، چاند کی چاندنی، فضاؤں کی سرسراہٹ، سائل کی صدا، مور کی ادا یہ سب کے سب مناظر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد والدین کے مرہون منت ہیں۔ اگر والدین نہ ہوتے تو یہ سارے مناظر نہ ہوتے نہ چاند کی چاندنی نظر آتی نہ سورج کی حرارت محسوس ہوتی، نہ بارش کے بعد زمین سے اُٹھنے والی بھینی بھینی خوش بو محسوس ہوتی نہ آسمان کے افق پر قوس قزح کے حسین و پرکشش منظر کوئی آنکھ دیکھتی۔ کائنات کی سب رنگینیاں اور حسن آفرینیاں والدین کا ہی صدقہ ہیں۔ والدین نہ ہوتے تو ہم بھی نہ ہوتے اور نہ ہی ان جملہ مناظر کا وجود ہوتا یہ سب کچھ والدین کے صدقے انسان کو ملا ہے۔

والدین کا مقام ارفع و اعلیٰ ہے۔ اگر بچہ چاہے تو اپنے والدین کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ یہ بات جب ذہن میں آتی ہے کہ ایک ماں اپنے بچے کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے تو دل میں عشق و محبت کا سیلاب آجاتا ہے۔ والدین کے لیے لواں لواں بے تاب ہو جاتا ہے۔ سردی کی یخ بستہ رات ہے، کپکپی اور ٹھٹھراہٹ ے کی وجہ سے دانت بجنا شروع ہو جاتے ہیں ماں اپنے بچے کو پہلو سے لگائے لوریاں دیتے ہوئے، بدن کو سہلاتے ہوئے، اپنے بدن کی طبعی حرارت

پہنچاتے ہوئے اپنے شیر خوار بچے کو خواب خرگوش کے مزے فراہم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔اور بچہ ماں سے لپٹ کر سو جاتا ہے۔رات کے پچھلے پہر جب سردی انتہا پر ہوتی ہے۔ہوا منجمد ہو کر برف کی شکل میں گرنا شروع ہو جاتی ہے اس وقت وہ شیر خوارگی کی عمر میں بول بستری کا شکار ہو جاتا ہے اور پورا بھیگ جاتا ہے ماں کی مامتا تڑپتی ہے اور بچے کو اُٹھا کر اپنی جگہ سُلا دیتی ہے اور خود اس گیلی جگہ پر پوری رات گزار دیتی ہے۔اندریں حالات کون سا شخص ایسا ہوسکتا ہے جو اپنے والدین کی عظمت کا قائل نہ ہو۔والدین کا مقام واقعی بڑا بلند ہے۔والد ساری زندگی اولاد کی فلاح و بہبود کے لیے مختص کر دیتا ہے۔سورج کی گرمی ہو،فقر و فاقہ یا شکم سیری ہو،دن ہو یا رات کا کچھ حصہ ہو ہمہ وقت اولاد کے لیے والد کو فکر دامن گیر رہتی ہے اور اسی میں وہ پوری زندگی گزار دیتا ہے والدین کا مقام،مقام شناس کے لیے انتہائی بلند و بالا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

صلوۃ التراویح اور جسم انسانی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور عظمت کا تاج اس کے سر پر سجایا۔ اس کو انبیاء کرام کے توسل سے آگاہ فرمایا کہ ہدایت کا راستہ کونسا ہے اور گمراہی اور ذلت کا راستہ کون سا ہے، اس کو اس کی پیدائش کی غرض و غایت سے بھی خبردار کیا کہ تمہاری پیدائش کا مقصد میری عبادت اور معرفت ہے۔ جو شخص زندگی بھر اللہ کی عبادت اور بندگی کرتا رہا وہ کامیاب و کامران رہا اور جس نے اس کی عبادت سے منہ موڑا خائب و خاسر ہوا۔

دیگر عبادات کی طرح صلوۃ التراویح بھی ایک اہم عبادت ہے۔ اس کی ادائیگی سے اس کو ڈھیروں نیکیوں کا خزانہ میسر آتا ہے وہاں یہ عبادت اپنے عبادت گزار کے جسم و جان کے لیے بھی انتہائی نافع ہے۔ جملہ عبادات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو اس سے یہ بات مترشّح ہو جاتی ہے کہ احکام الٰہی کی پیروی سے جہاں روحانی آسودگی کا سامان میسر آتا ہے وہاں جسمانی اعضاء کی صحت بھی برقرار رہتی ہے۔ نماز کی ترتیب بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ فجر کی نماز مختصر ہوتی ہے اور صرف چار رکعت کی ادائیگی سے مسلمان اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے۔ اور اس میں جو حکمت کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے جسم میں موجود معدہ خالی ہوتا ہے اور اس مختصر سی عبادت کی ادائیگی سے جسم انسانی میں کوئی گراوٹ محسوس نہیں ہوتی اور طبیعت سرور و نشاط محسوس کرتی ہے۔

دوپہر ظہر کی نماز میں 12 رکعت اس لیے رکھ دی گئی ہیں کہ انسان دوپہر کو کھانا کھا کر

عبادت کے لیے حاضر ہو جاتا ہے۔ اور تعداد میں اضافہ کے سبب اس کے معدہ کی حرکات وسکنات میں بھی زیادتی آجاتی ہے جو معدے میں موجود مواد کے انہضام کا باعث بنتی ہے اور یوں روحانی طراوت کے ساتھ ساتھ جسم کی کارکردگی میں بھی تیزی آجاتی ہے۔ اس طرح عصر کی نماز میں پیٹ خالی ہوتا ہے اور نماز مختصر ہوتی ہے۔ مغرب میں بھی تقریباً یہی صورتحال سامنے آتی ہے۔ عشاء میں رکعتوں کی تعداد میں اضافہ بھی اسی وجہ سے سامنے آتا ہے کہ رات کا کھانا اکثر لوگ مغرب کے بعد کھاتے ہیں تو پھر بعد میں عشاء کی نماز ادا کرتے ہیں۔ عشاء کی نماز کی طوالت کے سبب معدے پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ایک عبادت گزار شخص بغیر کسی اضافی ورزش کے رات کو اپنے بستر پر محو استراحت ہوتا ہے۔

رمضان المبارک چونکہ ماہ صیام ہے اور نیکیوں کی بہار گردانا جاتا ہے۔ اس ماہ میں مسلمانوں کے گھروں میں معاشی لحاظ سے رونق آجاتی ہے اور غریب سے غریب شخص کے آنگن میں بھی فصلِ بہار کے گل کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سحری و افطاری اپنے حسین مناظر کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ افطاری کے بعد انسان غیر ارادی طور پر اپنے معدے کو غذا سے بھر لیتا ہے اور پھر آگے وقت سحری بھی قریب ہوتا ہے۔ دوران ادائیگی نماز عشاء جب وہ صلوۃ التراویح جیسی عظیم عبادت سے ہمکنار ہوتا ہے تو یہ عبادت اس کے جسم کی فعالیت کو مزید بہتر بنانے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ صلوۃ التراویح کی ادائیگی سے انسان ایک بار پھر دن بھر روزہ رکھنے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔ صلوۃ التراویح دیگر اعضائے جسمانی کے لیے بالعموم اور معدے کے لیے بالخصوص انتہائی اہم عبادت ہے جس کی ادائیگی سے روحانی تازگی کے ساتھ ساتھ جسمانی فرحت بھی محسوس ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

فلسفہ قربانی

قربانی کا فلسفہ کوئی زیادہ پر پیچ نہیں بلکہ سیدھا اور سادا سا ہے یہ جملہ خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر حکم ربّی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لخت جگر کو قربانی کے لیے پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر محبوب سے محبوب ترین چیز بھی قربان کی جاسکتی ہے۔ قربانی جیسی عظیم عبادت جہاں قرب الٰہی کا سبب بنتی ہے وہاں غرباء و مساکین اور یتامیٰ کے لیے دعوت طعام کا ایک نمونہ ثابت ہوتی ہے۔ وہ لوگ جن کے گھر صرف سال بعد ہی گوشت کی مہک سے مہک اٹھتے ہیں۔ چیتھڑوں وں میں زندگی گزارنے والے افراد کے بچے گوشت کے پکنے کا بڑی شدت سے انتظار کرتے ہیں اور پھر غربت کی چکی میں پسنے والے افراد کے نونہالانِ وطن کے پیٹ میں اس عظیم نعمت کی ترسیل نعمتِ لازوال ثابت ہوتی ہے۔

قربانی ایک مالی عبادت ہے اور اس عظیم عبادت کو جب کوئی صاحب ایمان شخص اللہ تعالیٰ کا حکم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت سمجھتے ہوئے ادا کرتا ہے تو جہاں وہ مسرت وشادمانی حاصل کرتا ہے وہاں روحانی تازگی اور طراوت بھی اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ قربانی کرتے وقت ملحوظ خاطر صرف اور صرف رضائے الٰہی کا حصول ہو، اگر کوئی اور مقصد، کوئی اور تمنا، کوئی اور آرزو پیش نظر رہی، نمود ونمائش ذہن میں آ گئی، غرور وتکبر کی کوئی کرن جسم ناپائیدار پر جلوہ گر ہوئی، نیت میں تھوڑا سا بھی فتور آ گیا اور مقصد اپنے اصل ہدف سے بال بھر بھی ایک طرف ہو گیا تو لاکھوں روپے سے خریدے گئے جانور کی قربانی محض گوشت کا حصول ہوگا۔ آخرت میں ذرہ برابر بھی نیکی نظر نہ آئے گی اور کل

قیامت کے دن للّٰہیت ورضائے الٰہی کے متمنی شخص اس امیر کبیر شخص سے بازی لے جائیں گے خواہ اس کی قربانی صرف جواز کی حدتک درست ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت کا مفہوم محدود نہیں ہے۔ بلکہ بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔ انسان کی کامیابی اور کامرانی اس بات کی مرہون منت ہے کہ اس کی زندگی کے جملہ امور میں قربانی کا تصور بدرجہ اتم موجود ہو۔ وہ اگر سرخرو ہونا چاہتا ہے تو وہ خواہشات جو اس کو اس کے حقیقی مقصد سے کوسوں دور لے جانا چاہتی ہیں۔ ان کی قربانی دے اور عظمتوں کے قصرِ رفیع کو اپنا مسکن بنالے۔

حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمال کو نہیں دیکھتا بلکہ نیتوں کو دیکھتا ہے۔ عمل کتنا ہی حسین وجمیل کیوں نہ ہو اگر اس پر بدنیتی کا لیبل ہے تو وہ بارگاہ ایزدی میں غیر مقبول ہے۔ اور اگر نیت درست ہے تو پھر درست نیت کے حامل ذی شعور اور ذی فہم وفراست انسان کے آنگن میں نیکیوں کے گلہائے رنگارنگ خودرو پودوں کی طرح اُگتے ہیں اور بداعمال کی نحوستیں کافور ہوجاتی ہیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم معاشرے کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لیے کذب بیانی، دروغ گوئی، کینہ پروری، حسد وبغض، اقرباء پروری، رشوت ستانی اور خودغرضی جیسی غیر اخلاقی حرکات کے ساتھ وابستہ خواہشات کی قربانی دیں۔ ان خواہشات کو قربان کر کے ہی معاشرے اور قوم کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ اسلامی تعلیمات بالخصوص قربانی ہمیں یہی درس دیتی ہے۔ رضائے الٰہی کی خاطر دنیاوی مفادات جس حیثیت سے بھی ہوں ان کو قربان کردیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالیشان ہے کہ کسی شخص کو تکلیف مالا یطاق نہیں دی جاتی، اسلام کے جملہ احکام تعمیر انسانیت پر مبنی ہیں۔ زکوٰۃ، صدقات، حج اور قربانی صرف صاحب نصاب اور صاحب ثروت افراد پر واجب اور فرض ہے۔ کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے افراد ان عبادات کے مکلّف نہ ہیں۔ قربانی جذبہ ہمدردی بھی پیدا کرتی ہے۔ قربانی کے گوشت کی تقسیم میں تیسرا حصہ غرباء اور مساکین کا ہے شرعاً اگر اس سے زیادہ بھی اپنی ضرورت کے لیے رکھا جاسکتا ہے لیکن اسلام کی روح اس کے منافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ غرباء فقراء اور مساکین میں تقسیم کردیا جائے۔ صاحب ثروت حضرات اپنی قربانی کو حقیقی قربانی بنانے کے لیے نمود ونمائش سے بچیں اور اپنی نیتوں پر شیطانی گماشتوں کی نگرانی ختم کردیں۔ جذبہ ہمدردی کو پیش نظر رکھا جائے گوشت کی

تقسیم، قصاب کی اُجرت، جانور کو ذبح کرنے سے لے کر کھال کے صحیح استعمال اور دیگر فضلات زبیحہ کو ٹھکانے لگانے تک کے تمام مراحل میں خیر سگالی جذبات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر جملہ امور سرانجام دیئے جائیں اور خلق خدا کو تکلیف و کوفت سے محفوظ رکھا جائے یہی قربانی کا فلسفہ ہے اور اسی پر عمل پیرا ہو کر ہی انسان انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

شب برات اور آتش بازی کی قبیح رسم

انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ کام تھوڑا کرنا پڑے اور اس کی مزدوری اور اُجرت زیادہ مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کچھ اوقات ایسے مقرر کیے ہیں کہ اس میں دین اسلام پر کاربند شخص تھوڑی سی عبادت کر کے ڈھیروں ثواب کما سکتے ہیں۔ ان اوقات میں لیلۃ القدر یعنی شب برات بھی ہے جو پندرہ شعبان المعظم کی رات ہے اور کروڑوں مسلمان اس رات میں شبِ بیداری کر کے اپنے پروردگار کے سامنے سربسجدہ ہوتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی کے طلبگار رہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ:۔

''حم قسم ہے کتاب مبین کی بیشک ہم نے اتارا ہے اسے ایک برکت والی رات میں بے شک ہم ڈر سنانے والے ہیں، اس رات ہر حکمت والا کام بانٹ دیا جاتا ہے۔''

تشریح! یہاں کتاب مبین سے مراد کلام اللہ یعنی قرآنِ مجید فرقانِ حمید ہے اگرچہ بعض مقامات پر اس سے مراد لوح محفوظ بھی ہے۔ نزولِ قرآن کی رات کی عظمت و فضیلت کو ظاہر کرنے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی قسم ارشاد فرمائی۔ لیلۃ القدر برکتوں والی رات اس رات کے تعین میں مختلف اقوال ہیں لیکن عام طور پر دو قول زیادہ مشہور ہیں ایک تو یہ کہ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے جو ماہِ رمضان شریف میں آتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شبِ برات ہے جو شعبان المعظم کی پندرھویں رات ہے جیسا کہ تفسیر مظہری میں ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ پندرھویں شعبان کی رات ہے جس میں سال بھر کے امور لکھ دیئے

جاتے ہیں جنہیں مرنا ہوتا ہے انہیں زندوں کی فہرست سے نکال دیا جاتا ہے پھر ان میں نہ زیادتی کی جاتی ہے نہ کمی۔

حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔اس رات سے مراد یا شب قدر ہے (ستائیسویں رمضان) یا شبِ برات (پندرھویں شعبان) ہے (تفسیر نور العرفان تحت آیت مذکورہ) بہر حال جنہوں نے کہا لیلۃ المبارک سے مراد شعبان المعظم کی پندرھویں رات یعنی شب برأت ہے۔انہوں نے بھی بعض دلائل کی بنا پر کہا ان دلائل کا ذکر دوران تحریر اشارہ ہوگا" انزلناہ" ہم نے اتارا اگرچہ معنی دونوں کا اتارنا ہے لیکن اس کے باوجود دونوں میں فرق ہے۔انزلنا کا معنی ہے ہم نے بتدریجاً اتارا، ہم نے وقتاً فوقتاً نازل کیا تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔

مذکورہ بالا آیت میں بھی چونکہ "(انزلنا)" کا صیغہ بولا گیا تو آیت کا مفہوم یوں ہوگا۔یقیناً ہم نے اس قرآن کو ایک بابرکت رات میں دفعۃً نازل کیا تو اس سے مراد تو آغاز نزول قرآن ہوگا یا نزول اوّل ہوگا جو کہ لوح محفوظ سے پہلے آسمان پر ایک مقام خاص میں جسے بیت المعمور کہا جاتا ہے، یکبارگی نازل ہوا۔چنانچہ صاحب تفسیر روح المعانی رقم طراز ہیں۔اس بابرکت رات میں نزولِ قرآن سے مراد قرآن مجید کا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر یکبارگی اور دفعۃً نازل ہونا ہے، رہا اس کا نزول منجم (تدریجاً) جو کم وبیش تیئیس سال تک جاری رہا تو وہ آسمان دنیا سے قلب اطہر حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف تھا یہ قول امام ابن جریر وغیرہ سے مروی ہے اور یہ بھی ہے کہ آسمان دنیا میں اس مقام کا نام بیت معمور ہے جہاں قرآن مجید کا نزول ہوا اور وہ خانہ کعبہ کی چھت کے عین اوپر ہے یہاں تک کہ اگر بیت المعمور سیدھا نیچے زمین پر اترے تو خانہ کعبہ کی چھت پر اترے۔(تفسیر روح المعانی)

خیال رہے کہ قرآنِ مجید کی مختلف آیات اور مفسرین کرام کے اقوال کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ "انزلنا" جیسے نزول اوّل پر بولا گیا ہے ایسے ہی نزول ثانی پر بھی بولا گیا ہے جیسا کہ سورۃ القدر میں ہے انا انزلنہ فی لیلۃ القدر۔ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا، یعنی نازل کرنا شروع کیا۔اہل علم پہ یہ بات مخفی نہیں کہ یہاں بھی دفعۃً اور یکبارگی کا معنی پایا گیا اس لیے کہ ہر وحی دفعۃً اور یکبارگی نازل ہوئی۔

"لیلۃ مبارکۃ" "ایک بابرکت رات" قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں متعدد چیزوں کو مبارک یعنی بابرکت کہا گیا ہے ان میں سے ایک بیت اللہ شریف بھی ہے، جس کے بارے میں رب قدیر فرماتا ہے۔

بیت اللہ شریف بابرکت ہے تمام جہانوں کا راہنما ہے۔ بابرکت ہونے کی وجہ اوّل بیت اللہ شریف اور شبِ برات میں ایک قدر مشترک ہے جس کی وجہ سے دونوں بابرکت ہیں جس طرح اخلاص وللّٰہیت کے جذبے سے سرشار ہو کر بیت اللہ شریف کی زیارت کرنیوالا گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی شبِ برأت میں کوئی گناہ گار اور سیاہ کار تائب ہو کر اور اخلاص کے جذبے سے سرشار ہو کر قیام کرے تو اللہ اسے گناہوں سے پاک فرما دیتا ہے۔ بابرکت ہونے کی وجہ ثانی! نزولِ قرآن کی نسبت اس رات کی طرف ہے کہ اس رات قرآن نازل ہوا اس لیے یہ رات بابرکت ہوگئی۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی میں ہے اس رات کو "مبارکہ" (بابرکت) کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اس میں قرآن نازل کیا گیا جو تمام تر دینی و دنیاوی عزتوں کا باعث ہے۔ یا یہ کہ اس رات فرشتوں اور رحمتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے اور دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ نیز اس رات عبادت کرنے کی بے شمار فضیلت ملتی ہے یا یہ کہ اس رات مخلوق کا رزق لکھا جاتا ہے۔ تقدیر یعنی موت وغیرہ کے فیصلے ہوتے ہیں یا یہ کہ اس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے تیرھویں شعبان کی رات کو اپنی امت کے لیے بخشش مانگی تو تہائی امت کے حق میں آپ کی شفاعت قبول ہوگئی پھر چودھویں رات کو بخشش مانگی تو دو تہائی امت کی بخشش ہوگئی پھر آپ پندرھویں شعب (شبِ برأت) کو بخشش مانگی تو ساری امت کی بخشش ہوگئی، سوائے اس شخص کے جو مالک سے بھاگتے ہوئے شریر اونٹ کی طرح اللہ کا نافرمان ہو کر اس کی رحمتوں سے دور ہو گیا۔" نکتہ کی بات یہ ہے اور قابل غور بھی ہے اس سے پتہ چلا کہ جس رات نزول قرآن ہوا اگر بابرکت ہے تو جس رات نزولِ صاحبِ قرآن ہوا وہ کیوں نہ بابرکت ہوگی۔ واقعی یہ رات بابرکت ہے۔

(1) اس رات دریائے رحمت میں طغیانی آتی ہے جو گنہگاروں کے گناہوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتی ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جبریل امین علیہ السلام میرے پاس آئے اور فرمایا آج نصف شعبان کی رات ہے، اس رات اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد میں بندوں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے۔اس کے باوجود اللہ تعالیٰ مشرک کی طرف نظر رحمت نہیں فرماتا اور نہ ہی ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والے والدین کے نافرمان اور شراب پینے والے کی طرف نظر رحمت فرماتا ہے۔

(۲) حضرت ابوموسیٰ اشعری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرھویں رات کو تجلی فرماتا ہے اور سوائے مشرک اور دل میں کینہ رکھنے والے کے ساری مخلوق کو بخش دیتا ہے۔(مشکوۃ شریف بحوالہ ابن ماجہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمانو! جب شعبان کی پندرھویں رات (شبِ برأت) ہو تو رات کو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو بے شک اللہ تعالیٰ (چودھویں کا سورج غروب ہوتے ہی آسمان دنیا پر تجلی فرماتا ہے اور اس کی رحمتیں پکار پکار کر بندوں سے کہتی ہیں سنو! سنو! ہے کوئی تم میں سے بخشش طلب کرنیوالا کہ میں اس کو بخش دوں، ہے کوئی تم میں سے رزق کی فراوانی مانگنے والا کہ میں اس پر رزق کے دروازے کھول دوں، ہے کوئی پریشانیوں میں گھرا ہوا کہ میں اس کی پریشانیاں دور کر کے اسے سکون وعافیت عطا کردوں۔طلوع فجر تک رحمتیں بندوں کی تلاش میں رہتی ہیں۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے ، راہروِ منزل ہی نہیں

اللہ تعالیٰ نے اس رات کی صورت میں جو انعامات کی بارش ہم پر کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن ہم ہیں کہ اس عظیم نعمت کی قدر نہیں کرتے۔اس رات کو پاک صاف ہو کر نوافل ادا کئے جائیں، تلاوت کلام پاک کی جائے ،حقوق اللہ پورے کرنے کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی طرف توجہ دی جائے۔ہمسائے میں اگر کوئی غریب اور مفلوک الحال گھرانہ موجود ہے تو اس کی مدد کی جائے ،یتیم اور مسکین کو تلاش کر کے اس کی طرف دست تعاون دراز کیا جائے ، بیوہ اور غربت کی چکی میں پسنے والی خاتون کی غربت اور بے کسی کا خیال رکھا جائے۔آتش بازی سے پرہیز کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی دولت کا اسراف بھی ہے اور اس سے

کئی ناخوشگوار واقعات بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔آتش بازی کے کاروبار سے وابستہ لوگوں کو متنبہ کیا جائے کہ اس غلط حرکت سے اجتناب کریں۔اور نونہالانِ چمن کو اس قبیح عادت سے جو اس عظمت والی رات کے درخشندہ ماہتاب کو گہنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے محفوظ رکھیں۔آتش بازی کے بے دریغ استعمال سے کئی جانیں ضائع ہوتی ہیں، کئی گھر تباہ و برباد ہوتے ہیں اور کئی بچے ہاتھ پاؤں سے معذور ہو کر اپنی زندگی بھیک مانگ کر گزارتے ہیں۔اس لیے اس رات کی نورانیت سے اپنے دلوں کو منور کیا جائے نہ کہ آتش بازی سے گھر کے گھر ویران اور برباد کیے جائیں۔اسلام مال کے ضیاع کی نفی کرتا ہے اور فضول خرچوں کو شیطان کا بھائی قرار دیتا ہے۔

تعلیم نسواں

علم جہاں پہنچتا ہے اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے،ظلمت سے ضیاء کی طرف روانگی ہو جاتی ہے، جہالت سے شعور و آگہی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔علم ایک ایسی دولت ہے جو انسان کو اوجِ ثرّیا تک پہنچا دیتی ہے۔علم ایک ایسا زینہ ہے جس سے معرفتِ الٰہی کے محل کی طرف رسائی ممکن ہے۔علم کے زیور سے مرصّع شخص معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔علم کی حقیقتوں سے آشنائی ایک عظمت ہے اس طرح عورت علم کے زیور سے مزیّن ہوگی تو معاشرہ سنور جائے گا۔

مردوں کی بھی تعلیم ضروری تو ہے مگر
پڑھ جائے جو خاتون تو نسلیں سنوار دے

تعلیم نسواں سے مراد عورتوں کی تعلیم ہے۔مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی حصول علم بہت ضروری ہے۔عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ان دونوں پہیوں کا صحیح ہونا بہت ضروری ہے۔ورنہ زندگی کی گاڑی ٹھیک طرح سے چل نہ سکے گی۔کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس قوم کی عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر

فرض ہے۔'' اس حدیث مبارکہ سے مرد اور عورت دونوں کی خاطر علم کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے آگاہی کے لیے عورتوں کے لیے بھی ہفتے میں ایک دن مقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ ازواجِ مطہرات بھی عورتوں کو دین کی باتیں سکھایا کرتی تھیں۔ داناؤں کا قول ہے کہ'' ایک مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے، جبکہ ایک عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے'' عورت کی آغوش ہی بچے کی پہلی درسگاہ ہے۔ یہ جو کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے، زندگی بھر اس کا اثر اس کے دل و دماغ پر رہتا ہے۔ تعلیم یافتہ مائیں ہی بچوں کی بہترین پرورش اور تربیت کرسکتی ہیں۔ ایک جاہل اور ان پڑھ عورت اپنے بچے کی اچھی تربیت کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ گو کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بچے کی تربیت میں باپ کا بھی بہت حصہ ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بچے کو ابتدائی تعلیم ماں کی گود سے ہی ملتی ہے۔ بڑی بڑی عظیم شخصیتوں نے ماں کی گود سے ہی اچھی تربیت پائی اور کامیاب زندگی گزاری۔

مکالمات فلاطُوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے نُور سے پھوٹا شرارِ افلاطُوں

فطری و ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت مرد سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عورتوں نے دنیا میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور دے رہی ہیں۔ آج کے دور میں عورتیں صرف تعلیم اور ڈاکٹری کے شعبہ تک محدود نہیں ہیں۔ آج عورتیں گھریلو امور سے لے کر جہاز اڑانے تک تمام شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کررہی ہیں۔ اگر کچھ لوگ عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ ان کی جہالت اور تعصب ہے، ورنہ تو سچ یہ ہے کہ ایک بہترین معاشرہ کی تشکیل کے لیے پڑھی لکھی ماں کا وجود سب سے اہم اور ضروری ہے۔

تعلیم یافتہ خواتین نے تاریخ میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ نور جہاں، رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی جیسی باہمت عورتوں نے ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں اور قابل ذکر کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے تاریخی سیاسی کردار سے کون واقف نہیں۔ ان کے ساتھ کئی دوسری خواتین نے بھی گھر گھر جا کر قائداعظم کا پیغام پہنچایا۔ بیگم سلمٰی تصدق حسین، بیگم شاہ نواز، بیگم ہارون، بیگم مراتب علی، بیگم کاکا خیل اور دوسری کئی تعلیم یافتہ خواتین

نے تحریکِ پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور یہ ثابت کیا کہ پڑھی لکھی خواتین ہی معاشرتی و سیاسی زندگی میں قابل قدر کارنامے سرانجام دے سکتی ہیں۔

معدن زر معدن فولاد بن سکتی نہیں
بے ادب ماں باادب اولاد جن سکتی نہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆

قیام پاکستان اور قرآن

مالک ارض وسماء کا ہم پر بے پایاں احسانِ عظیم ہے جس نے ہمیں وطن عزیز جیسی عظیم نعمت سے سرفراز فرمایا اور آزادی جیسی بے بہا دولت مرحمت فرمائی۔ انسانی تاریخ کے کسی دور کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے خواہ یہ دور غاروں کا دور ہو، یا جھونپڑیوں کا، محلات کا ہو یا مکانوں کا، کاغذ کا دور ہو یا دھاتوں کا، پتھروں کا دور ہو یا سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے گھروں کا تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہر دور میں انسانی تہذیب وتمدن کے انداز بدلے ہیں کلچر اور ثقافت کے نئے نئے نقشوں نے جنم لیا ہے، افکار وحوادث کے رنگہائے جدید قائم ہوئے ہیں، خیالات نے انقلاب کا جامہ زیب تن کیا ہے۔ اس کے باوجود تاریخ انسانی کے ہر دور میں ایک قدر مشترک ہر قوم وملت میں بدرجہ اتم موجود رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ تضادات وتباین کے باوجود اور اختلاف وتنوع کے باوصف انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ اور ہر حال میں اور ہمہ وقت آزادی کی حمد وستائش کی ہے اور اپنی آزادی کو قائم رکھنے کی جہد مسلسل اور سعی کامل کی ہے۔ اس جہد مسلسل اور مساعی جمیلہ کا نام تاریخ انسانی ہے۔

ہندوستان میں جب تحریک آزادی نے جنم لیا اور قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا تو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کی راہنمائی قرآن کی روشنی میں کی۔ آپ نے مغرب کے جمہوری نظام کو اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مغرب کا

جمہوری نظام استبداد ملوکیت کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوع انسانی آزادی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ دوسرے یہ کہ مغربی انداز فکر اور مغربی نظام جمہوریت اسلام کی ضد ہے۔ اس میں مسلمانوں کو وہ آزادی میسر نہیں آسکتی کہ جو اسے اسلام عطا کرتا ہے۔ اس مغربی نظام جمہوریت نے اور اشتراکیت نے یہ آوازہ بلند کی کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں ان کو حق حکومت پہنچتا ہے۔ مگر قرآن کریم اس مفروضے کو باطل قرار دیتا ہے۔ قرآن کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے قرآنِ پاک کے مطابق حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں یہ نکتہ عوام النّاس کے قلوب واذہان میں لانا چاہتا ہے کہ حکومت اللہ کی کتاب یعنی قرآنِ حکیم کے ذریعے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کا دخل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔

برصغیر کے مسلمان تحریکِ آزادی میں شریک ہوئے اور اس جدوجہد آزادی میں اس نظر یہ اساس کے ساتھ مستعد و متحرک ہوئے کہ وہ پاکستان قائم کریں گے جہاں قرآن کی حکومت ہوگی۔ اور اللہ کا قانون نافذ ہوگا۔ ان کے پاس جذبہ صادق تھا۔ یہ ان کے ایمانِ کامل ہونے کی دلیل تھی اور ان کا یقین محکم تھا کہ دنیا کی بڑی طاقت مسلمانان برصغیر کے جوش ایمانی کے سامنے زیر ہوگئی اور غیر ملکی استعمار نے ہار مان لی۔

یہ کرشمہ بھی ہے کہ پاکستان ٹھیک اس دن عالم وجود میں آیا اور منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا جس دن 27 رمضان المبارک تھی، یومِ نزول قرآن تھا۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ یہ نظام الٰہی تھا کہ پاکستان ایسے دن قائم ہوا کہ جو تمام عالم اسلام کے نزدیک مبارک و متبرک ہے اور جس کی عظمت و تقدیس میں پورا عالم اسلام متفق ہے درحقیقت اللہ کا یہ بڑا اہم فیصلہ تھا۔ کیونکہ منشاء الٰہی یہی تھا کہ پاکستان قائم ہوا اور اس میں حکومت قرآن قائم ہوئی۔

یوم آزادی کے دن ہم چراغاں کرتے ہیں، مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں، جھنڈیوں سے گھروں اور بازاروں کو سجاتے ہیں، قمقمے روشن ہوتے ہیں، یومِ آزادی والی رات بازار کو دلہن کی طرح سجا کر اپنا مقصد ہم پورا کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک قیام پاکستان کا مقصد یہی تھا جو ہم نے حاصل کرلیا۔ آزادی کا مقصد جو ہم نے سمجھ رکھا ہے وہ یہی ہے کہ ہم لوگ مادرِ پدر آزاد ہوگئے، عدل وانصاف سے آزاد ہوگئے، زہد وتقویٰ سے آزاد ہوگئے، امانت و دیانت سے آزاد

ہو گئے، حق صداقت سے آزاد ہو گئے، شریعت وطریقت سے آزاد ہو گئے، شرافت ولیاقت سے آزاد ہو گئے، فرمانبرداری والدین سے آزاد ہو گئے، عظمت کبائر اور شفقت صغائر سے آزاد ہو گئے۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے آزادی کا مقصد یہ تھا کہ ہم انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے آزاد ہوں نہ کہ ہر قسم کی نیکی، احسان، بھلائی واچھائی کو خیر آباد کہہ دیں۔

عنوان ''قیام پاکستان اور قرآن'' قرآنِ پاک میں اگرچہ پاکستان کا لفظاً ذکر نہیں ہے لیکن احکام الٰہی پر عمل پیرا ہونے کے لیے ارض پاک کا ہونا انتہائی ناگزیر ہے اور ارض پاک کا دوسرا نام پاکستان ہے، لفظاً ذکر واقعی نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسی جگہ جہاں اللہ کی حکومت ہو، جہاں احکامِ الٰہی کی پابندی خشوع وخضوع سے کر سکیں۔ جہاں نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ ہو، جہاں نظامِ اسلام کا نفاذ ہو، جہاں چور کے ہاتھ کاٹے جائیں، جہاں قاتل کو قرار واقعی سزا دی جائے، جہاں زانی کو سنگسار کیا جائے، جہاں تہمت لگانے والے کو سزا دی جائے، قرآن پاک میں پاکستان کا ذکر تو نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسی جگہ ہو کہ جہاں بلا جبر وکراہ رضائے الٰہی اور رضائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے کام کیا جائے، جہاں ناپ تول میں کمی کرنے والے نہ ہوں، جہاں شرابیوں کا وجود تک نہ ہو، جہاں ڈاکہ زنی نہ ہو، جہاں اقرباء پروری نہ ہو، جہاں رشوت ستانی نہ ہو، جہاں خون ریزی نہ ہو، جہاں دہشت گردی نہ ہو، قرآنِ پاک میں ہماری سرزمین کا ذکر تو نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہاں ایسے لوگ ہوں، جو ملاوٹ کے حروف ابجد سے بھی واقف نہ ہوں یہاں تازہ گوشت ہو، خالص دودھ ہو، معیاری سرخ مرچ پسی ہوئی ہو، خالص دیسی گھی ہو ان جیسی نعمتوں سے مستفیض ہو کہ لوگ عبادتِ الٰہی سے اپنے من کے گھروں کو اور اپنے تن کے گھروں کو منور اور مستنیر کریں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے جس مقصد کے لیے ہمیں یہ خطہ نصیب ہوا ہم نے اس مقصد کو پسِ پشت ڈال دیا اور فراموش کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم غیروں کا سہارا لیے ہوئے ہیں اور غیروں کو ہماری تضحیک اڑانے کا موقع مل رہا ہے۔ ہم نے صعوبتوں اور مصیبتوں کو خود پر مسلط کر لیا ہے۔ یہ سب کچھ اسلام سے اور بانیٔ پاکستان کے فرمودات سے دوری کا نتیجہ ہے۔ قائداعظم کی روح بہشت بریں کے جھروکوں سے ہمیں دیکھ رہی ہے کہ پاکستان ہم نے اس مقصد کے لیے نہیں بنایا جس کے لیے تم اسے استعمال کر رہے ہو، اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کی جائے

ورنہ قائداعظم کی روح یوں پکارے گی۔

کیا اس لیے چنوائے تھے تقدیر نے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

☆☆☆☆☆☆☆☆

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

قوم کسی پتھر کا نام نہیں ہے، کسی ویرانے میں کھڑے درخت کا نام نہیں ہے کسی بہتی ہوئی ندی کا نام نہیں ہے، کسی لہلہاتے ہوئے کھیت کا نام نہیں ہے، قوم افراد کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ قومیں بنتی ہیں اور قومیں بگڑتی بھی ہیں، قومیں سنورتی بھی ہیں اور قومیں برباد بھی ہوتی ہیں کبھی قومیں تنزلی کا شکار ہوتی ہیں اور کبھی ترقی کی معراج پر فائز ہو کر دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کرتی ہیں۔

اقوام کے بگاڑنے اور سنوارنے میں افراد کا ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ فرد قوم کی ایک اکائی ہے، اکائی ایک جُز ہوتا ہے اور جُز سے اجزاء بنتے ہیں اور پھر یہ اجزاء مل کر ایک قوم کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اقوام کی قسمت اور تقدیر افراد ہی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اگر افراد پڑھے لکھے ہیں تو قوم پڑھی لکھی ہے اور اگر افراد ان پڑھ اور گنوار ہیں تو پھر قوم بھی اسی طرح کی ہوتی ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس مِصْرَعَہ میں اپنی قوم کی تقدیر کے بارے میں اظہارِ خیال اس طرح کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور بے عملی کا شکار ہو تساہل اور غفلت اس کی عادت ثانیہ بن چکی ہو تو وہ اپنی قوم کے لیے کوئی قابلِ قدر خدمات سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس نے قوم کی تقدیر کو بدلنے کے لیے اپنا رول ادا کرنا ہے۔ کوئی فلکی مخلوق نہیں آئے گی کہ اس کے حالات بدل دے۔ اس لیے خود تگ و دو کرنا پڑے گی، بستر استراحت کو چھوڑنا پڑے گا، زرق برق لباس زیب تن کر کے نمود و نمائش کے بت کو پاش پاش کرنا پڑے گا، خلوص دل سے اپنے ملک و قوم کے لیے قربانی دینا پڑے گی۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ”بے

شک اللہ تعالیٰ اس قوم میں تبدیلی نہیں لاتا جو اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتی۔'' (القرآن)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اقوام کی تقدیر کو بدلنے کے لیے، اقوام کی قسمت کے ستارے کو درخشاں رکھنے کے لیے اقوام کو حیات نو بخشنے کے لیے، اقوام کو آفاق میں متعارف کروانے کے لیے، اپنی قوم کو دیگر اقوام کے ہم پلہ کرنے کے لیے، ہر فرد کو اپنی اپنی ذمہ داری نبھانا ہوگی۔ وہ نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ اپنے ضمیر کو بھی ہمیشہ مخاطب کرے کہ اگر زندگی ہے تو پھر عوام کی خدمت کر کے ہی زندگی کو زندہِ جاوید بنانا ہے۔ خلوص نیت سے قوم کی تقدیر بدلنے میں کمر بستہ ہو جائے اور ہمیشہ یہ صدا لگاتا رہے کہ

خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

قوم کی تقدیر بدلنے میں ہر فرد اپنا اپنا حصہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ڈال سکتا ہے۔ ابتداء اپنے گھر سے کرے خانگی امور میں ندرت پیدا کرے، گھریلو ماحول کو اسلامی ماحول میں ڈھالے، والد ہے تو اس کا کردار مثالی ہو، بھائی ہے تو اس کا کردار بے نظیر ہو، بیٹا ہے تو وہ بھی ایک فرمانبردار اور تابع لخت جگر ہو، کمرہ صاف کرنا ہو تو اس کے تمام کونے کھدرے صاف کیے جاتے ہیں، صرف بیٹھنے یا لیٹنے کی جگہ صاف کرنے سے کمرہ صاف تصور کرنا ناممکن ہے۔ اسی طرح اقوام کی تقدیر کو بدلنے کے لیے، قوموں کی تقدیر کو سنوارنے کے لیے ابتدا گھر سے کرنا پڑے گی۔ گھریلو فضا بہتر ہوگی، افرادِ خانہ اپنے تقریباً ساڑھے پانچ فٹ قد پر اسلام نافذ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو پھر محلے اور معاشرے کے لوگوں کو بدلنا آسان ہوگا۔

طالب علم اگر ہے تو وہ بامقصد تعلیم حاصل کر کے قوم کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ معلم ہے تو طلباء کو معیاری تعلیم کے زیور سے مزیّن اور مرصّع کر کے اپنا حصہ ڈال سکتا ہے۔ واعظ اور خطیب ہے تو منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیٹھ کر پر مغز گفتگو اور اخلاق پر مبنی گفتگو کر کے اپنی بات عوام تک پہنچا کر قوموں کی زندگی میں حیاتِ نو بخشنے کا سبب بن سکتا ہے۔ شاعر ہے تو وہ معیاری اشعار کے ذریعے خوابیدہ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں اپنا رول ادا کر سکتا ہے۔ مجاہد ہے تو وہ سرحدوں کی حفاظت کر کے اپنی قوم کے بناؤ سنگھار میں حصہ لے سکتا ہے۔ اگر طبیب ہے تو دکھی اور تڑپتی ہوئی انسانیت کے مرض کہن کو دور کر کے شامل ہو سکتا ہے۔ اگر کسان ہے تو وہ

اپنی فصل کو وقت پر پانی لگا کر وقت پر کاشت کر کے، وقت پر اس کی برداشت کر کے معاشرے کے غریب عوام کو بروقت فصل اور جنس پہنچا کر اپنے آپ کو اس کشتی میں سوار کر سکتا ہے۔

الغرض اقوام کی تقدیر بدلنے میں، معاشرے کو صحیح خطوط پر استوار کرنے میں عوام النّاس کو معاشی لحاظ سے، معاشرتی لحاظ سے، جسمانی لحاظ سے، اقتصادی لحاظ سے، روحانی لحاظ سے مضبوط کرنے کے لیے ہر فرد کو اپنا کردار ادا کرنا پڑے گا۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ہم ہیں وطن کے پاسباں / ہم وطن کے محافظ

وطن اس خطہ زمین کو کہتے ہیں جس سے انسان کو نسبت ہوتی ہے، جس کی فضا سے انس ہوتا ہے، جس کی ہوا سے اسے موانست ہوتی ہے۔ یہ فطرتی بات ہے کہ جس جگہ انسان کی پیدائش ہوتی ہے وہاں کی ذی روح اور غیر ذوی العقول مخلوق سے قلبی لگاؤ ہوتا ہے اور پھر اس تعلق اور لگاؤ کی بنیاد ہر دم واپسیں تک اس کا یہ سلسلہ مؤدت قائم رہتا ہے۔

انسان کے ساتھ اس محبت اور پیار کے اٹوٹ انگ کے طور پر عمر بھر منسلک رہتا ہے اور یوں اس کے شب و روز گزرتے رہتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان تو وطن کے ساتھ محبت اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے "حب الوطن من الایمان" وطن کی محبت ایمان سے ہے۔ یعنی تکمیل ایمان کے لیے وطن کی محبت انتہائی ضروری ہے۔ اور یہ جس کے ساتھ حقیقی محبت ہو، جس کے ساتھ زندگی کے ایّام بحسن وخوبی گزارے ہوں، اُس کی حفاظت اور اس کی پاسبانی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر اُس کی حفاظت اور پاسبانی کا فریضہ ادا کرنے پر نفس آمادہ نہ ہو اور طبع نازک پر یہ گراں گزرے تو پھر وطن کی محبت کا دعویٰ زبانی کلامی تو ہو سکتا ہے اس کا حقیقت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایک شخص حفاظت کا دعویدار ہے لیکن اس کی موجودگی میں عنادل خوش الحان کی بجائے بوم نے شاخہائے وطن پر قبضہ کر رکھا ہے تو اس کی حفاظت اور محبت کا یہ دعویٰ کھوکھلا ہے۔ ایک دہقاں کی زبان کھیت وکھلیان سے محبت کا اظہار کرتی ہے لیکن اس کی خوبصورتی کو خس وخاشاک نے ختم کیا ہوا ہے تو اس کا یہ قول بھی درست اور صائب

نہ ہے۔وطن ہمارا ہے اور ہم اسے جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔اس کی فضاؤں کی سرسراہٹ ،اس کی ہواؤں کی آہٹ،اس کی آبشاروں کی گڑگڑاہٹ،اس کی بادلوں کی گھن گرج،اس کی بادِنسیم کی اٹھکیلیاں ،اس کی کہکشاؤں کے چمکتے ہوئے رنگ ،اس کے قمر کے روشن نظارے،اس کے آفتاب کے حسین چمکارے، یہ سب ہمارے اپنے ہیں اور ہم ہی اس کے پاسباں ہیں۔

موج بڑھے یا آندھی آئے دیا جلائے رکھنا ہے
گھر کی خاطر ہر دکھ جھیلیں ، گھر تو آخر اپنا ہے

ہم نے وطن کی حفاظت کا اظہار صرف بلند و بالا نعرے لگا کر نہیں کرنا ہے،ہم نے وطن کی ہر شے کی حفاظت کرنی ہے۔اس سرزمین سے منسلک ہر چیز کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے ہم اس کی آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں تو یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس کی حفاظت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں ،اور اس کے لیے ہمیں اپنے شعور کی شمع کو روشن کرنا ہوگا۔ہمیں علم و عمل کے زیور سے مرصّع ہونا ہوگا۔ہمیں جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو آفتاب علم و حکمت کی کرنوں سے ختم کرنا ہوگا۔ہمیں اس کی طرف اُٹھنے والی ہر میلی آنکھ کو نکال باہر پھینکنا ہوگا۔اس کی حفاظت اور پاسبانی سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ اس کی سرحدوں کو دشمنوں کی یلغار سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کے گرد آنے والی غیر ملکی اور ملک دشمن عناصر کی گرد کو ختم کیا جائے بلکہ اس کی حفاظت اور پاسبانی کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے باشندگان کو اور یہاں کے عوام کو آپس میں مل جل کر رہنے کے آداب سکھائے جائیں۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے ڈھنگ سکھائے جائیں اور ایک دوسرے کی فکری صلاحیتوں کو مثبت انداز میں تعمیری کاموں میں صرف کرنے کے اصول وضوابط بتائے جائیں اصل میں یہی وطن کی محبت بھی ہے اور یہی اس کی حفاظت بھی ہے اور یہ کام تعلیم و تعلم کے میدان سے گزرے بغیر ناممکن ہے۔کیونکہ علم نور ہے اور یہی روشنی اور نور حقیقی پاسبانی کے سلیقے سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ہم نے وطن کی حفاظت کرنی ہے اور اس کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا کیونکہ یہ ہمارا اپنا وطن ہے اور ہم ہی اس کے پاسبان ہیں۔

اس کے چشمہ کا پانی ہو یا پھر آب جو
کرتا ہے جو پاسبانی ہے وہ راشدؔ سرخرو

☆☆☆☆☆☆☆

اچھے شہری کی ذمہ داری

کائنات کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے جہاں ہر کس و ناکس اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے وہاں اچھے شہری کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کائنات بنائی ہے اُس میں رہ کر اچھے شہری ہونے کا ثبوت دے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام پریشانیوں کا سدّباب کرے۔ ایک اچھا شہری نہ صرف اپنی ذات کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے بلکہ وہ اپنے کردار سے، اپنی گفتار سے، اپنے طور و اطوار سے کوئی ایسی بات کا مرتکب نہیں ہوتا جس سے اس کے وجود سے نفرت کی جائے۔

اچھا شہری صرف وہی نہیں جو صبح اُٹھے سیر کو جائے اور پھر نماز ادا کرے اور تلاوت کلامِ پاک کرے اسی طرح وہ اپنی صبح نو کا آغاز کرے اور اس طرح خاموشی سے دن گزار دے، اچھا شہری تعلیمی ادارے کا سربراہ ہوسکتا ہے، اچھا مدرس ہوسکتا ہے، اچھا دوکاندار ہوسکتا ہے، اچھا سیاستدان ہوسکتا ہے، اچھا قانون دان ہوسکتا ہے، اچھا منصف ہوسکتا ہے۔

اچھے شہری کی ہی ذمہ داری ہے کہ گھر کے اندر، معاشرے کے اندر، خویش و اقارب کے اندر اگر کوئی برائی دیکھتا ہے تو وہ اس کا قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے یہ اس کی ذمہ داری ہے اور دینی فریضہ بھی! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دیگر مسلمان محفوظ رہیں، ہر شخص جب تک اپنا تعمیرانہ کردار ادا نہ کرے اپنی دھرتی کو بقعۂ نور نہیں بنا سکتا، اپنی اس زمین میں عقل و خرد، عدل و انصاف، اخوت و بھائی چارہ کی فضا پیدا نہیں کرسکتا۔

اچھے شہری کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل پیرا ہوکر جہاں برائی دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے روکے اور اگر ہاتھ سے روکنے کی حالت میں نہیں ہے تو پھر وہ زبان سے منع کرے اور اگر زبان سے منع نہیں کرسکتا تو پھر اس کو دل سے بھی بُرا جانے اور یہ کمزور ایمان کی علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیثِ پاک ایک اچھے شہری کی اہم ذمہ داری بیان کررہی ہے۔ اس طرح اگر ہر شخص اس حدیث پر عمل پیرا ہو جائے تو برائی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ برائی کو بالکل ختم کیا جاسکتا ہے، اس سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا علاج ہوسکتا ہے۔

اچھے شہری کے لیے باکردار ہونا انتہائی ضروری ہے یہ نہیں کہ وہ دیگر حضرات کو تو نیکی کا حکم دیتا رہے اور خود اس پر عمل نہ کرے اس طرح اسکی کوشش رنگ نہ لائے گی۔ اس کے قول پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ تم دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، انسان کی تگ ودو اور جدوجہد اس وقت بارآور ثابت ہوسکتی ہے جب کہ خود ذہنی طور پر تیار ہو اپنی کوشش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اخلاص کی دولت سے مالا مال ہو۔ اور بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہو۔

ایک شخص جس میں قول وفعل کا تضاد نہ ہو، جس میں انانیت کی بو نہ آتی ہو، جس کی گفتار میں حق وصداقت کے پھول ہوں، جس کے لین دین میں اسلامی اصولوں کی پاسداری کی جاتی ہو، جو کرسی عدالت پر بیٹھے تو اچھا انصاف کرے، جو طبیب ہو تو اچھا مسیحا ثابت ہو، جو مجاہد ہو تو سرحدوں کی حفاظت کو اپنا فریضہ گردانے، جو مبلغ ہو تو اپنی تبلیغ سے عوام النّاس کے دلوں پر حکومت کرے، واعظ ہو تو وعظ ونصیحت سے معاشی اور معاشرتی برائیوں کو جڑ سے اکھیڑ پھینکے، مدرس ومعلم ہو تو اپنی تدریس سے طلباء کو معاشرے کا اہم رکن بنانے میں مدد ومعاون ثابت ہو تو گویا وہ شخص اچھا شہری کہلانے کا حق دار ہے۔

بحیثیت مسلمان اچھے شہری کی ایک اہم ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام میں پورا پورا داخل ہو جائے۔ اسلام کے ابدی اصول اس کی شخصیت کی شناخت بن جائیں۔ اس کی پیشانی پر سجدوں کی وجہ سے پڑے ہوئے نشانوں میں حقیقت کا رنگ غالب ہو، اس کی جملہ عادات اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ہوں، اس کا وجود دیگر حضرات کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو، اس کی حیات لوگوں کے

لیے ایک انعام ہو، تو یہ علاقے کے لیے ایک حسن ہے، زیب وزینت ہے اور خوشحالی کا سبب ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی ہماری ذمہ داری ہے، ایک اچھے شہری ہونے کے ناطے ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ پر عمل کرتے ہوئے، کرپشن، اقربا پروری، ظلم وجبر، دھوکہ دہی، فریب کاری، نوراکشتی جیسی قبیح عادات سے معاشرے کو چھٹکارا دلائے اور یہ سب اچھے شہری کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اچھا شہری بن کر اہم ذمہ داریوں کے نبھانے کے ساتھ ساتھ اچھا مسلمان بھی بنائے۔

انگریزی ذریعہ تعلیم ہماری ضرورت

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اس میں رہنے والے لوگ اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہیں جتنے دیگر ممالک کے لوگ علم سے بہرہ ور ہیں۔ اس کی وجوہات اور بھی بہت سی ہیں ان میں ایک وجہ انگریزی سے عدم دلچسپی ہے۔ انگلش لینگوئج سیکھے بغیر ہم دیگر اقوام کے ہم پلہ ہونے کا دعوی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کسی قوم کے نشیب وفراز، افراط وتفریط اور اس کے اسباب کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی زبان پر گرفت انتہائی ضروری ہے۔ ازاں بعد ہی ہم اپنی خوبیوں اور خامیوں کا اس سے موازنہ کر سکتے ہیں اور ترقی کی راہ میں آنیوالی رکاوٹوں کا سدباب کر سکتے ہیں۔ دیگر اقوام کا مطالعہ ہی ان کی تاریخ سے آشنا کرتا ہے اور پھر وہ اسباب جن کی بدولت اس اقوام پر تنزل اور ترقی کا دور گزرا اس سے آگاہی ہوتی ہے۔ آج کل ترقی یافتہ اقوام اسی زبان سے وابستہ ہیں۔ اس لیے اس کو ذریعہ تعلیم بنانا اس لحاظ سے ضروری ہے۔

انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے اور متعدد ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے پھر اپنی اقتصادی اور معاشی ترقی کے لیے اس کی تفہیم کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری نئی نسل اس زبان سے واقفیت کی بدولت ہی معیاری قسم کی ملازمتوں سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔ انگریزی سے واقفیت کی بنا پر ہم اپنے تعلیمی معیار کو بلند کر سکتے ہیں، دیگر ممالک کی جامعات میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ تدریسی فرائض سرانجام دے سکتے ہیں۔ آج کل اکثر ممالک اس زبان کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں شروع سے ہی انگلش کو ذریعہ تعلیم بنایا ہے۔

پاکستان میں بھی انگلش میڈیم سکول سسٹم کا اجرا ہو چکا ہے اور ہمارے ارباب اختیار اس کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں، یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ شروع سے ہی بچے کو انگلش سیکھنے کی طرف مائل کر دیا جاتا ہے، اس کا ذخیرہ الفاظ بڑھا دیا جاتا ہے پھر دینی طور پر بھی اس کے سیکھنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ ہمارے دینی چینل پر بھی اس کے سیکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

بحیثیت مسلمان تبلیغ کے لیے بھی ہم نے کوشش کرنی ہے، ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " **بلغوا عنی ولوایہ** "میری طرف سے پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو دینی نقطہ نظر سے بھی انگریزی زبان کی تحصیل انتہائی ناگزیر ہے، ہم نے جب غیر مما لک میں جا کر اسلام کی تبلیغ کرنی ہے تو وہاں کی زبان سے آشنائی نہایت اہمیت کی حامل ہے، عرب مما لک میں تبلیغ کے لیے عربی کی ضرورت ہے، فارسی زبان بولنے والے مما لک احکام دین کی تبلیغ کیلیے فارسی زبان کی تفہیم انتہائی ضروری ہے۔ اسی طرح جب ہم سنت صحابہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے گھر بار کو خیر آباد کہتے ہیں اور تبلیغ دین کے لیے یورپین مما لک کا سفر کرتے ہیں تو یہ بات کتنی افسوس ناک ہوگی کہ ہم متعلقہ مما لک کے حروف ابجد سے بھی واقف نہ ہوں اور انگلش زبان جس میں ہم نے تبلیغ کرنی ہے اس سے ہمیں کوئی واقفیت نہ ہو۔

انگلش زبان سے ہماری آشنائی کے لیے اور غیر اقوام سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کے لیے جو خدمات ہمارے سلف صالحین نے ہمارے لیے سرانجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں بالخصوص سر سید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ اسی مقصد کے حصول کے لیے ایک انتھک جدوجہد تھی۔ آج تمام مقابلے کے امتحان اسی زبان میں ہوتے ہیں۔ اور اسی زبان پر گرفت مضبوط رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں ہی ملک کی باگ ڈور ہوتی ہے، اور انتظامی امور چلانے میں، دفتری امور کی بجا آوری میں انگلش زبان کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے یہ باور کرنے میں بالکل پس وپیش نہیں ہونا چاہیے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم ہماری ضرورت ہے اور اس کے بغیر معاشی ترقی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صحت وصفائی

اسلام ایک پاکیزہ دین ہے۔اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے، یہ طہارت ونظافت کو بہت اہمیت دیتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو پاکیزگی اور صفائی کی بہت تلقین کرتا ہے، جو شخص صفائی اور نظافت کا خیال رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے از حد پسند کرتے ہیں اور ان کے نزدیک وُہ قابل تعریف ہے، اسلام جہاں قلبی و باطنی تعلیمات دیتا ہے وہاں ظاہری صفائی کے احکامات بھی جاری کرتا ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرا رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔(القرآن)

پاکیزگی اور صفائی ایمان کا حصہ ہے۔ (الحدیث)

اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔ (الحدیث)

جہاں تک خوبصورتی اور حسن و جمال کا تعلق ہے وہ بغیر صفائی کے کبھی پیدا نہیں ہوسکتی، صفائی وصحت کا لفظ ظاہراً چند حروف کا مجموعہ ہے لیکن اس میں معانی ومفاہیم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود ہے۔صحت وصفائی لازم وملزوم ہیں۔صفائی صحت کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔مقولہ ہے کی صفائی ہے تو خدائی ہے۔آج ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے جتنی صفائی کی ضرورت ہے کسی اور چیز کی نہیں ہے۔انسان کی صحت درست ہوگی تو دماغ بھی درست ہوگا اور اگر صحت درست نہ ہوگی تو دماغ بھی درست سمت کا تعین نہیں کر سکے گا۔جس ادارے میں صحت مند طلباء کی تعداد زیادہ ہوگی اس کے نتائج بھی دیدنی ہوں گے۔روزانہ

غسل، مسواک اور صاف ستھری وردی پہن کر آنے والا طالب علم پورا دن چاک و چوبند رہتا ہے۔ پورا دن مستعد رہ کر اپنی پوری توجہ اسباق میں دیتا ہے، ہوم ورک باقاعدگی سے کرتا ہے، اس کی صحت معیاری ہوتی ہے، اس کا دماغ شاہین کا دماغ ہوتا ہے، الجبرا اور ریاضی کے دقیق کلیے اس کو علم کے حصول میں آنیوالی مشکلات کا قطعاً حصہ نہیں بنتے، منطق فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے میں اسے کوئی دیر نہیں لگتی۔ اس کے علم الرغم چارپائی سے اُٹھ کر سیدھا سکول آنے والا طالبعلم، سارا دن تساہل، کسلمندی، غفلت اور اکتاہٹ کا شکار رہتا ہے۔ اس کی صحت معیاری نہیں ہوتی، اس کا دماغ ضعف اور کمزوری کی بھینٹ چڑھ چکا ہوتا ہے۔ اس کے اعصاب مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کی تعلیمی حالت کمزور ہوتی ہے اس کی توجہ اسباق پر قائم نہیں رہتی نتیجتاً وہ تعلیم سے باغی ہو جاتا ہے اور معاشرے کے لیے مرد بیمار کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

صفائی ہو گی تو انسان کی صحت بہتر ہو گی صحت بہتر ہو گی تو وہ ملک وقوم کے لیے اپنی خدمات پیش کر سکے گا ورنہ وہ تو اپنے مسائل میں الجھا رہے گا وہ ملک وقوم کی خدمت کے تصور سے نا آشنا ہو گا۔ اسلامی نقطہ نظر سے صفائی کا خیال انتہائی ضروری ہے، عبادات کی ادائیگی کے لیے وضو کی فرضیت اسی لیے ہے کہ انسان معبود حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے پہلے اپنے آپ کو صاف ستھرا اور پاکیزہ بنا لے۔ طبی نقطہ نظر سے بھی صفائی ناگزیر ہے جو گھر، محلّہ، علاقہ، شہر صفائی کے تصور سے نابلد ہوتا ہے وہاں صاحبِ فراش حضرات کا فقدان نہیں ہوتا ہے۔ جس جگہ پر گندے پانی کے جوہڑ ہوں، غلاظت کے ڈھیر ہوں، کوڑے کرکٹ کے انبار ہوں، مچھروں نے جینا حرام کر رکھا ہو تو وہاں معدودے چند ہی صحتمند حضرات ہوں گے۔

ظاہری صفائی کے ساتھ ساتھ باطنی صفائی بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہے اگر کسی کا ظاہر پاک ہے اور باطن ناپاک تو وہ اس بوتل کی مانند ہے جس میں شراب ہو اور اوپر کسی مشرقی مشروب کا لیبل لگا ہو، صحت وصفائی سے مراد یہاں صرف جسم کی نہیں بلکہ روح کی صفائی بھی ہے۔ جسم صحتمند اور صاف ہو لیکن روح بیمار اور اخلاقی بیماریوں کی وجہ سے مردہ ہو چکی ہو تو اہلِ بصیرت اس صحت کو صحت اور اس ستھراپن کو کبھی ستھراپن نہیں سمجھتے ان کے نزدیک صحت وصفائی سے مراد روح اور جسم دونوں کی صحت وصفائی ہے۔ جسم کو صحتمند اور صاف ستھرا رکھنے کے لیے ظاہری اشیاء کی ضرورت ہے اسی طرح روح کی صفائی کے لیے نفرت، حسد، بغض، عداوت

جیسی اخلاقی بیماریوں کو نکال باہر پھینکنا ہوگا۔ روح اور جسم دونوں صحتمند ہوں گے تو پھر زندگی کی گاڑی اپنی اصل اور حقیقی صورت میں رواں دواں ہو سکے گی۔ جن سلف صالحین نے اس دنیاوی زندگی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے انہوں نے دونوں کی صحت اور صفائی کا خیال رکھا اور گلستانِ ہستی میں رنگا رنگ پھول کھلائے۔ معاشرے میں، قوم میں، ملت میں ملک میں انارکی، خلفشاری، بےکلی اور بےسکونی کی فضاء کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

صفائی عجب چیز دنیا میں ہے
صفائی سے بڑھ کر نہیں کوئی شے

صبح کی سیر

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر نعمت سے مستفید ہونے کے لیے بنی نوع انسان کو وافر مقدار میں مواقع فراہم فرمائے اور اسے یہ باور کرانے کی ترغیب دی کہ وہ زمین پر نکلے اور مظاہر فطرت کا بغور مشاہدہ کرے، دیکھے کہ شجر دحجر، بحر و بر، کوہ و دامن کا وجود کس طرح اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا واضح ثبوت پیش کر رہا ہے۔ صبح کی سیر اگرچہ ظاہراً تو جسمانی صحت کو بحال رکھنے کے لیے ناگزیر ہے لیکن حقیقتاً یہ مظاہر فطرت سے بالمشافہ گفت وشنید کا نام ہے یہ جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ روحانی طور پر بھی انسان کو پاکیزہ اور فعال بناتی ہے۔

صبح کی سیر سے انسان کا دل اور دماغ تر و تازہ ہو جاتا ہے، کام کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے، طبیعت میں تساہل اور غفلت کی انگڑائیاں لیتے ہوئے جذبات کا فور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ دماغی صلاحیت میں اضافہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ نسیمِ صبح جب اٹھکیلیاں کرتی ہوئی قریب سے گزرتی ہے تو فہم وادراک کے آنگن میں بہار آ جاتی ہے، نظریات وتصورات کا تفاوت ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ گراں خوابی کے دور سے پیدا ہونے والے زخم آفتاب کی مسیحائی کرنوں سے مُندمل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی

صبح کا وقت سہانا ہوتا ہے، شب کے بحرِ ظلمات میں ہچکولے کھاتی ہوئی ناؤ اُجالے کے

ناخداؤں کے طفیل سنبھلنا شروع ہو جاتی ہے۔صبح کا منظر پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں پر ہو، دریاؤں اور سمندروں کی خونی موجوں اور لہروں پر ہو، چٹیل میدانوں پر ہو، کھیتوں اور کھلیانوں پر ہو، ہمیشہ بھلا ہی نظر آتا ہے۔صبح کی سیر چھوٹے قد کا شخص کرے، یا طویل القامت جسامت والا کرے، دبلا پتلا کرے یا لحیم شحیم یہ ہر ایک پر اپنے صحت افزاء اثرات مرتب کرتی ہے۔اس کی صحت بخش اور پر تاثیر فضاء سے کوئی ذی روح محروم نہیں رہتا ہر ایک اپنا اپنا حصہ بقدر جُثّہ وصول کرتا ہے۔

صبح کی تازہ ہوا جب جسم و جان میں سرایت کرتی ہے تو اعضائے جسمانی کا اضمحلال ختم ہو جاتا ہے۔قویٰ مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کے اس انمول انعام سے مستفید ہونے والے حیوان ناطق کا جسم خلعتِ فاخرہ زیب تن کرتا ہے، نسیمِ صبح کے حیات بخش جھونکے عروق مردہ کو حیات نو بخشنے کا سبب بنتے ہیں، صبح کی سیر کا عادی شخص جملہ امور ہائے زندگی کی انجام دہی میں ہمیشہ چست و چالاک اور مستعد رہتا ہے، غفلت، تساہل، کسلمندی جیسے الفاظ سے اس کی ڈائری کے اوراق نا آشنا ہوتے ہیں۔

صبح کی سیر ارادی ہو یا غیر ارادی ہمیشہ سودمند رہتی ہے۔صبح کی سیر بالعموم ہر شخص کے لیے اور بالخصوص ایک طالب علم کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔صبح کی سیر کے عادی طالب علم اور غفلت و لاپرواہ طالب علم میں بُعد المشرقین ہوتا ہے، چست و چالاک طالب علم ہمیشہ اپنی جماعت میں اپنے ادارہ میں، اپنے اساتذہ میں اپنی قابلیت کا لوہا منواتا ہے، فزکس و کیمسٹری الجبرا اور ریاضی کے گنجلک اور پیچیدہ قوانین بھی اس کی راہ میں سد سکندری ثابت نہیں ہوتے۔جبکہ لاپروا، غافل اور دیر تک سونے کے متوالے طالب علم پر پورا دن مُردنی چھائی رہتی ہے۔اور اس طرح وہ تعلیمی میدان میں کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کرسکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ایٹمی توانائی کا پرامن استعمال

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ہمارا وطن عزیز پاکستان بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ اسے اپنی تعمیر و ترقی کے لیے مختلف ذرائع و وسائل سے کام لینا چاہیے۔ ہمارے مشہور وسائل قوت، معدنی تیل، قدرتی گیس، برقی طاقت اور بائیوگیس وغیرہ ہیں۔ شمسی توانائی بھی ایک وسیلہ قوت ہے لیکن اس سلسلے میں ابھی تک کوئی قابل قدر پیش رفت نہیں ہوئی۔ تعمیر و ترقی کے میدان میں ہماری ضروریات اس قدر وسیع اور لامحدود ہیں کہ موجودہ وسائل اور ذرائع قطعاً نا کافی ہیں۔ اس لیے ہمیں لامحالہ ایٹمی توانائی کے حصول اور پھر اس کے پرامن استعمال پر اپنی مساعی اور کوششوں کو مرکوز کرنا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور پیہم روز افزوں ضروریات کے پیش نظر اگر ہم نے اس شعبے میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا تو ہماری تعمیر و ترقی کا تمام تر نظام اور پروگرام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

اپنی توانائی کے حصول کے بعد اس سے ایٹمی دھماکہ مطمع نظر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا پرامن استعمال پیش نظر رہے۔ اس سے منشاء اور مراد ہو کہ ٹیکنالوجی کے شعبے میں استحکام اور فروغ ہوتا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکیں اور عوام کو پرمسرت زندگی کی ساعتیں دے سکیں۔

ایٹمی ٹیکنالونی میں پیش قدمی کا صنعت و زراعت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ ایٹمی پیش رفت نے الیکٹرانک انڈسٹری پر خوشگوار اثر ڈالا ہے اور بہتر نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ تعلیم کے میدان

میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال سے ہم اپنے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں عظیم انقلاب برپا کر سکتے ہیں مثال کے طور پر ہم تکنیک استعمال کر کے زرعی پیداوار میں دس گنا اضافہ کر سکتے ہیں۔ پاکستانی سائنسدانوں نے چاولوں کی ایک نئی قسم کشمیر باسمتی تیار کی ہے اور اس سے آزاد کشمیر، سوات اور پہاڑی علاقوں کے حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ اب وہاں تین چار ہفتے پہلے ہی فصل تیار ہو جاتی ہے اور سردیوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔

ایٹمی توانائی کا اگر پُرامن استعمال ہو تو کئی دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ایٹمی شعاؤں کے ذریعے زرعی اجناس کو دیر تک ٹھیک حالت میں رکھا جاتا ہے۔ آلو اور گندم کو ڈیڑھ دو سال تک خراب ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ ہماری فصلوں کی 20 فیصد پیداوار کیڑے مکوڑے کھا جاتے ہیں۔ اگر سٹوریج میں ایٹمی شعائیں استعمال کر لی جائیں تو ہم بڑے نقصان سے محفوظ ہو جائیں گے۔

ایٹمی توانائی کا وسیع تر بنیادوں پر حصول ہمارے لیے اشد ضروری ہے۔ ورنہ ہم کبھی بھی تعمیر و ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں کر سکتے۔ ہمارے ملک میں پسماندہ طبقہ بھی موجود ہے اور خوشحال لوگ بھی موجود ہیں۔ کسمپرسی سے دوچار عوام جو فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہے ہیں وُہ شکل وصورت میں خوشحال طبقہ کے مساوی ہیں لیکن صرف بھوک اور غربت کے دیو نے ان کے قویٰ کو مضمحل کر رکھا ہے۔ ان کے شب و روز تنگدستی کے عالم میں بسر ہو رہے ہوں تو ان کے لیے بہتر سوچ رکھنے والا ہر شخص نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ اور اس وقت اس قسم کی خالص فکر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے وسائل اس حد تک بڑھائیں کہ ہماری عوام خوشحال ہو اور خوش و خرم زندگی بسر کرے۔ نا کہ ہم ایٹمی توانائی کے حصول کے بعد ایٹمی دھماکے کا سوچیں یہ ہماری سوچ کی غلط سمت ہوگی۔

ایٹمی توانائی کی دولت سے اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں مالا مال کیا ہوا ہے، ہمارا شمار ایٹمی دولت کے ممالک میں ہونے لگا ہے تو یہ خدا کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس نعمت غیر مترقبہ سے نوازا ہے۔ لیکن ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں مزید نعمتیں دوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میں نعمتیں بھی واپس لے لوں گا اور میرا عذاب بھی سخت ہے'' تو ہم اس عظیم نعمت کا شکرانہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کا استعمال پرامن کریں اور اپنی صنعتی اور اقتصادی ترقی کے لیے اس کے جملہ ذرائع بروئے کار لائیں نہ کہ انسانیت کے قتل اور خاتمے

کے لیے استعمال کریں۔ ایٹمی توانائی کا پرامن استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے۔

آج اگر ہم دیگر اقوام کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔ تنگدستی کا زوال چاہتے ہیں فراوانی کا عروج چاہتے ہیں۔ کھیتوں کو لہلہاتا دیکھنا چاہتے ہیں، گلستانوں کو معطر اور سرسبز و شاداب دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ غیر ممالک کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنا چاہتے ہیں، ضعیف کو توانا اور صحتمند دیکھنا چاہتے ہیں، غریب و بے کس کو دولت مند دیکھنا چاہتے ہیں تو ایٹمی توانائی کا استعمال پرامن طور پر کرنا ہوگا۔

ملکی وسائل اور ان کا استعمال

دنیا کے تمام ممالک اپنے اپنے وسائل رکھتے ہیں اور ان وسائل کے صحیح استعمال سے ان کے باشندگان کی گاڑی شاہراہِ حیات پر رواں دواں ہے۔ ہر ایک کے وسائل مختلف ہیں اور ہر ملک ان وسائل کا استعمال مختلف انداز میں کرتا ہے۔

پاکستان بھی ان وسائل سے مالا مال ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان گراں قیمت وسائل سے پاکستان کی سرزمین کو بھرپور کر رکھا ہے۔ کسی ملک کی ترقی کا راز اپنے وسائل سے آشنائی ہے اور مزید برآں یہ کہ اپنے وسائل کا صحیح استعمال ہے۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ نے تیل، کوئلہ، لوہا اور نمک کی صورت میں معدنی وسائل کا ذخیر وفراہم کیا ہوا ہے، اسی طرح قدرتی گیس بھی موجود ہے لیکن ان سے کما حقہ فائدہ صرف اسی طور پر اٹھایا جاسکتا ہے کہ ان کا استعمال سائنسی بنیادوں پر ہو، ان کے استعمال میں شعوری اور فکری قویٰ کو بروئے کار لایا جائے۔

سائنسی بنیادوں پر اس کا استعمال کرنے سے ان کی افادیت بڑھ جاتی ہے، ان کی فراہم کردہ سہولتوں میں متعدد اضافہ ہو جاتا ہے۔ تیل کا اگر صحیح استعمال کریں گے۔ اس سے وسیلہ قدرتی کی افادیت سے کماحقہٗ فائدہ اٹھائیں گے تو اس سے ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا۔ ملک میں چلنے والے کارخانے اپنی پیداوار میں اضافہ کریں گے، انسان کی مجموعی پوزیشن بحال ہوگی۔ اس کی عظمت رفتہ عود کر آئے گی۔

قدرتی وسائل سے مالا مال قوم جب اس کا استعمال سیکھ جاتی ہے تو پھر اس کا شمار ترقی

یافتہ اقوام میں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔اس کے بچے،نوجوان اور بوڑھے ایک مثالی کردار ادا کرتے ہیں،بعض وسائل ایسے ہوتے ہیں جو زمین کے اندر ہوتے ہیں اور بعض وسائل ایسے ہوتے ہیں جو زمین کے اوپر فصلوں اور جنگلات کی صورت میں ہوتے ہیں۔ان وسائل کا صحیح استعمال ہی اقوام کی زندگی میں انقلاب لاتا ہے۔اوران وسائل کا صحیح استعمال ان عظیم لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے جو خداداد صلاحیتوں کے زیور سے مرصّع ہوتے ہیں اور خداداد صلاحیتوں سے ہمارے لوگ اس عظیم منصب کے کبھی اہل نہیں ہوئے۔

قدرتی وسائل خواہ وُہ معدنی وسائل کی صورت میں ہوں یا فصلوں اور جنگلات کی صورت میں ان کا صحیح استعمال ہی اصل میں زندگی ہے،اگر ان کا صحیح استعمال نہ کیا جائے،تساہل اور غفلت میں وقت گزار دیا جائے۔صحیح مشینری استعمال نہ کی جائے اور مشینری کے استعمال کے اصول وضوابط سے آگاہی حاصل نہ کی جائے تو گویا یہ وسائل کا صحیح استعمال نہ ہے اور پھر ان وسائل کی ناقدری بھی ہے۔اور جب کسی نعمت کی ناقدری کی جاتی ہے تو پھر وُہ نعمتیں زیادہ دیر تک پاس نہیں رہتیں اور یہ انعامات انسان سے ہمیشہ کے لیے روٹھ جاتے ہیں۔یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ ہم پر وسائل کی صورت میں انعامات الٰہیہ کی بہتات ہے۔

دنیا کے اندر جتنے ممالک بھی موجود ہیں ان کی ترقی،ان کی عظمت،ان کے استحکام کا راز اپنے اپنے وسائل کے صحیح استعمال میں مضمر ہے۔وہ قوم ترقی کے زینے طے کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی جس کے ضمیر میں کی صلاحیت موجود ہو،جس طرح اعضائے جسمانی کے غلط استعمال سے جسم انسانی میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔اسی طرح وسائل کے غلط استعمال سے معاشرہ،قوم،ریاست اور ملک عضو معطل ہو کر رہ جاتا ہے پھر جس کے نصیب میں حیات بخش خون کے قطروں کی روانی نہیں ہوتی متعفن اور سڑانڈ زدہ مسموم ہوا اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا

شہرت، ناموری، سروری یہ ایسے حروف ہیں جس کا ہر شخص خواہاں رہتا ہے۔ جیسے ہی شباب کی کلیاں چٹخنا شروع ہو جاتی ہیں ناموری کی آرزو انگڑائیاں لینا شروع کر دیتی ہے۔ اور پھر بتدریج اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن نامور بننے اور شہرت وعروج کے منصب پر فائز ہونے کے لیے سخت محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے راتوں کو دن بنانا ہوتا ہے، وقت کی قربانی دینی پڑتی ہے، جہد مسلسل کا عادی بننا ہوتا ہے۔ حصول عظمت کی خاطر سخت جدوجہد انتہائی ناگزیر ہے۔

دنیا و مافیھا میں ہر ذوی العقول خواہ وہ گورا ہو، پست قد ہو، طویل القامت ہو، دبلا پتلا ہو یا لحیم شحیم ہو، یہودی ہو، نصرانی ہو یا آتش پرست ہو، الغرض جس مسلک یا مشرب سے منسلک ہو اس بات کا وہ ضرور معترف کہ اگر کوئی عظمت، آن بان اور تفوق کے سہرے سے اپنے آپ کو سجانا چاہتا ہے تو وہ صرف اور صرف محنت اور مشقّت سے ہی ایسا کر سکتا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے ''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے اور محنت کرتا ہے''

بنی نوع انسان کی تاریخ کے اوراق کا اگر مطالعہ کریں اور بسلسلہ مشاہدہ چشم بینا وا کریں تو یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ جن سلف صالحین اور نابغۂ روزگار ہستیوں نے نام پیدا کیا وہ شب و روز محنت اور مشقت کی چکی میں پستی رہیں۔ علامہ اقبالؒ، غزالی، رازی نفیسی جیسے زعماء جو آسمان

علم و دانش پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ یہ سب ان کی محنت لگن، کاوش اور انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھا۔محنت شاقہ اور جذبہ صادق ہوتو کہساروں سے بھی جوئے شیر نکالی جاسکتی ہے۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

شعبہ ہائے حیات میں اگر کوئی نام پیدا کرنے کا متمنی ہے تو پھر اپنے آپ کو انتھک جدوجہد محنت، مشقت اور جہد مسلسل کا عادی بنانے اور محکم یقین اور عزم صمیم کے ساتھ آگے بڑھتا جائے ایک دن آئے گا کہ دنیا کی نعمتیں اس کی گود میں ہوں گی اور سروری اور سرداری اس کے دروازے پر دستک دے گی۔ احساس کمتری کی کیفیت کو پاس تک نہ پھٹکنے دیں۔ اور دن بدن نئی آن اور نئی شان کے ساتھ آگے بڑھتے جائیں یہی سلیقہ قوموں کی زندگی میں انقلاب برپا کردیتا ہے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ طلباء خواہ دینی داروں کے ہوں یا جامعات اور کالجز کے ہوں۔ اپنے مستقبل کو درخشندہ اور تابندہ کرنے کے لیے محنت و مشقت کو عادت ثانیہ بنائیں۔ آرام طلبی، کاہلی، سستی اور غفلت کے پردے چاک کردیں، معاشرے میں عظیم مقام پیدا کرنے کے لیے علم کے ساتھ عمل کے زیور سے اپنے آپ کو مزیّن کریں یہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور موجودہ دور کا تقاضا بھی، وہ کامیابی اور کامرانی کے حصول کے لیے جہد مسلسل کو اپنا وتیرہ بنائیں۔ کسی میدان میں فتح ونصرت کے جھنڈے لہرانے کے لیے محنت شاقہ پر مداوت جزو لاینفک ہے۔ کیونکہ پانی کا ایک قطرہ زمین چوس جاتی ہے اور جب تسلسل سے پانی پڑتا ہے تو ریگستان بھی سیلاب میں بدل جاتے ہیں۔

مشقت کی ذلت جنھوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی

☆☆☆☆☆☆☆

لائبریری کی اہمیّت

ہم نشینی اگر کتاب سے ہو
اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں

لائبریری سے مراد کتب خانہ ہے۔ لائبریری کی اہمیت سے مراد اس چیز کی اہمیت نہیں کہ اس کی بلڈنگ کا خام مال بہت اچھا ہے، اس کے گردونواح اور مضافات کے باسی بہت اچھے ہیں۔ اس کے افتتاح کرنے والے کا کردار بہت اچھا ہے، اس کو بنانے والے کا کاروبار بہت اچھا ہے، اس حسین وجمیل بلڈنگ کو تعمیر کرنے والا معمار بہت اچھا ہے۔ لائبریری کی اہمیت سے مراد اس کے اندر جو کتب ہیں ان کا مطالعہ کتنی اہمیت کا حامل ہے، اس کے مطالعہ سے نوجوان کو کتنا فائدہ پہنچتا ہے، اس کے مطالعہ سے بوڑھے قاری کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کا مطالعہ معاشرے پر کیا اثرات مرتّب کرتا ہے۔

لائبریری کا وجود خواہ وہ سکول لائبریری ہو، خواہ وہ پبلک لائبریری ہو، خواہ وہ ذاتی لائبریری ہو ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں انتہائی ضروری ہے۔ اساتذہ اور طلباء کے لیے کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ انتہائی ناگزیر ہے، اساتذہ کو نئی تحقیقات سے بہرہ ور ہونے کا موقع میسر آتا ہے اور طلباء بھی اپنی نصابی اور غیر نصابی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر تعلیمی ادارے میں معیاری لائبریری کا وجود ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ ادارہ ایسا ہے جیسا نخلستان چشمے کے بغیر یا ایک گھر پانی کے بغیر، لائبریری گویا ایک چشمہ ہے جس کے آب زلال سے

تشنگانِ علم ودانش اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

تاریخ کی ورق گردانی کریں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو کتب بینی ومطالعہ میں ہمیشہ ایک امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔اسلام کے زمانۂ عروج میں مسلمان اُمراء میں لائبریری کا اہم مقابلہ ہوتا تھا۔جس شخص کے پاس جتنا بڑا کتب خانہ ہوتا تھا اس قدر وہ معزّز اور باوقار سمجھا جاتا تھا حالانکہ اس زمانے میں پریس کی سہولت نہ تھی اور لوگ اپنے ہاتھ سے کتابیں لکھتے تھے۔مسلمانوں کے علمی شوق اور ذوق مطالعہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عباسی خلیفہ مامون الرشید نے باقاعدہ ''باب الحکمت'' کا الگ شعبہ قائم کررکھا تھا اور جو شخص کسی یونانی کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کرتا تھا اُسے اس کتاب کے برابر سونا عنایت کیا جاتا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان اس علمی ذوق سے محروم ہوگئے اور غیروں نے یہ ذوق اپنالیا۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

موجودہ دور میں لائبریری کا شعبہ باقاعدہ ایک سائنس اورفن کی شکل اختیار کرچکا ہے اوراس کے بہت عمدہ قواعد وضوابط مرتب کیے گئے ہیں۔ناظم لائبریری کو باقاعدہ اس فن کی تربیت دی جاتی ہے۔لائبریری میں مختلف موضوعات کی کتابوں کوشعبہ وار تقسیم کردیا جاتا ہے۔ مثلاً مذہب واخلاق،علم وادب،تاریخ سائنس، فلسفہ ناول وافسانہ،شعروشاعری، سوانح عمریاں،سفرنامے اورنصابی کتب کے شعبے بنالیے جاتے ہیں اور کتابوں پر باقاعدہ نمبرز لگا دیئے جاتے ہیں اس طرح مطلوبہ کتابوں کوتلاش کرنے میں آسانی رہتی ہے۔

کتب خانوں سے محبت عظیم لوگوں کا شیوہ ہوتی ہے۔کتابوں کا مطالعہ کرنے والا آسمانوں کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے،کتب بینی ایک ایسا ذوق ہے جس سے جہالت کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور مطلع دل ودماغ پرعلم ودانش کا آفتاب چمکنا شروع ہوجاتا ہے۔کتابوں کے مطالعہ سے تاریخ عالم پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔قوموں کے عروج وزوال کے اسباب سامنے آتے ہیں،ملک وقوم کی ترقی وتنزّل کی وجوہات سے آشنائی ہوتی ہے۔کتب بینی روحانی اور جسمانی بالیدگی کا سبب بنتی ہے۔معیاری کتب بعد از مطالعہ قاری پر بڑے گہرے نقوش

چھوڑتی ہیں۔

ایک مفکر کا قول ہے'' کچھ کتابیں محض سیکھنے کے لیے ہوتی ہیں، کچھ نگلنے کے لیے اور صرف چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں خوب چبانا اور ہضم کرنا ہوتا ہے۔'' علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے'' ایسی کتاب جس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھنے کے لائق ہو صدیوں کے بعد آتی ہیں۔''

معیاری کتب کے مطالعے سے جہاں دیگر شعبوں میں تبدیلی آتی ہے وہاں معیاری کتب کی تصنیف و تالیف بھی منصّہ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ابن خلدون نے مقدمہ ابن خلدون تصنیف کی تو لائبریری کے مطالعہ کے بعد، سرسید احمد خاں نے اسباب بغاوت ہند لکھی تو کتب خانہ کی ورق گردانی کے بعد، ڈپٹی نذیر نے مرأۃ العروس لکھی تو لائبریری میں جانے کے بعد، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے پیامِ مشرق اور بانگ درا لکھی تو لائبریری کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد، امام غزالی نے کیمیائے سعادت اور احیاء العلوم لکھی تو اس میں لائبریری کا عمل دخل تھا۔ داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب لکھی تو لائبریریوں کی کتب کی ورق گردانی کے بعد، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے معیاری اخلاق پر مبنی کتابیں'' گلستان اور بوستان'' تصنیف کیں تو لائبریریوں کی چھان بین کے بعد لائبریریوں کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لائبریری میں داخل ہو کر کتب کا انتخاب کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے اگر بری کتاب کوئی ہاتھ لگ گئی تو وہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک اچھی کتاب دل و دماغ پر اور عادات و اطوار پر اچھا اثر ڈالتی ہے، اور محزن اخلاق اور بے ہودہ کتاب طبیعت کو برائی کی طرف مائل کرتی ہے۔ الغرض لائبریری کی اہمیت مسلمّہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مار نہیں پیار

زندگی میں انسان کو کئی حوالوں سے زندگی کا احساس دِلانا ہوتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ وہ شاہراہ حیات پر رواں دواں ہے خواہ وہ راستے خاردار جھاڑیوں سے پر ہو یا اس پر از ہار و اثمار سے لدے درخت کی ٹہنیاں سر جھکائے محوِ حمد و ثناء ہوں۔ زندگی مسائل سے بھری ہوئی ہو یا اس کی رنگینیاں، رعنائیاں اظہر من الشّمس ہوں۔ انسان کو کسی نہ کسی صورت میں ان سے واسطہ رہتا ہے۔ انسان کبھی خوش و خرم ہوتا ہے اور کبھی ناراضگی کے باعث اس کی پیشانی پر شکن واضح ہوتی ہے۔

زندگی میں انسان سے کوئی اچھا عمل سرزد ہوتا ہے تو اسے انعام و کرام سے نوازا جاتا ہے اور اگر اس سے کوئی خطا سرزد ہوتی ہے تو اس کو اس کی سزا بھگتنا پڑتی ہے، اچھے کام کی انجام دہی پر اچھے صلے کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور سہواً یا عمداً کوئی غلطی ہو جائے تو وہ سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ دین اسلام میں بھی جزاء و سزاء کا تصور موجود ہے، عابد اور صالح مسلمان کے لیے وعدۂ حور و قصور موجود ہے۔ خاطی اور گنہگار کے لیے وعید جہنم کا تصور موجود ہے۔ اگر یہ تصور ختم ہو جائے تو حصول راحت کے لیے کی جانے والی مساعی جمیلہ کی چمک ماند پڑ جائے گی اور سزا کی طرف مائل ہونے والی حرکتیں اور اعمال سیّہ کی کثرت ہو جائے گی ''مار'' کا تصور موجود ہے اور ''پیار'' کا تصور بدرجہ اتم موجود ہے۔

یہ ہماری عظمت ہوگی ''مار نہیں پیار'' کو اپنے معاملات میں جب داخل کریں گے، اور

محبت وشفقت کا وتیرہ اپنائیں گے تو اس خصلت حمیدہ کی آفاقیت سے کسی طور بھی صرف نظر نہیں کر سکتے۔ یہ اسلوب ایک طالب علم کے لیے فرحت بخش ثابت ہوگا۔ اگر چہ مار کے تصور سے تاریخ کے اوراق شاہد ہیں لیکن محبت اور پیار کی پینگ ایک ایسی پینگ ہے جس کے ہلارے زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیتے ہیں، محبت اور پیار کی فضاء ایک ایسی فضاء جس سے مستفید ہونے والا شخص اپنے کردار کی عظمت کے حوالے سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور معاشرے کے گلستان میں گلہائے رنگارنگ کی شگفتگی کا سبب بنتا ہے۔ ایک طالب علم جب تعلیمی ادارے کی چار دیواری میں اپنا قدم رکھتا ہے۔ تو تعلیمی ادارے کی فضاء اس کے کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس کا ماحول اس کے کردار کی بناوٹ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ طالب علم کو سکول میں اگر ماحول مشفقانہ ملے گا تو اس کی طبیعت تعلیم کے حصول کی طرف کلیتًا مائل ہوگی۔ جابرانہ رویے طالب علم کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی لانے میں کوئی مرکزی کردار ادا نہیں کرتے۔

یہ بات مترشّح ہے کہ جتنی قوت اور طاقت ترغیب میں ہے اتنی سکت ترھیب میں نہیں ہے، جو کام محبت اور پیار سے پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے وہ رعب اور دبدبے سے ناممکن ہوتا ہے۔ تعلیمی درس گاہوں کا اگر وزٹ کیا جائے اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعلیمی ترقی کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ شوق سے تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی زندگی جہاں سکونِ جسمانی کے زیور سے مزیّن ہوتی ہے وہاں روحانی طور پر بھی طالب علم مطمئن ہوتے ہیں۔

محبت سے حاصل کیا جانے والا علم دیر پا ہوتا ہے، اساتذہ کے احترام میں تصنّع اور بناوٹ نہیں ہوتی، طالب علم تحصیل علم کے لیے ہمہ قت مستعد اور تیار رہتا ہے، استاد کے پر مغز اقوال اس پر اچھے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ سکول انتظامیہ اور رئیس مدرسہ کا مشفقانہ رویّہ طالب علم کے کردار میں نمایاں تبدیلی لانے کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علی الرغم وہ طالب علم جو زدوکوب کا شکار رہتا ہے، استاد کا جابرانہ رویہ اس پر مثبت انداز منطبق کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ استاد کی جھڑک، زجروتوبیخ، تلخ اور کڑوی کسیلی باتیں طالب علم کے ذہن میں مثبت تبدیلی لانے کی بجائے تشدد پسند جذبات کی پیدائش کا باعث بنتی ہیں۔ ایک طالب علم جب اپنے

استادمحترم کو جو روحانی باپ بھی ہوتا ہے۔ایک تھانیدار اور حوالدار کے روپ میں دیکھتا ہے تو اس کے خیالات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے،اس کی طبیعت میں اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔اس کے مزاج میں تلخی پیدا ہوتی ہے اور اگر یہ رویّہ دوطرفہ ہو اور روحانی معلم کے علاوہ حقیقی باپ بھی شدت پر اتر آئے اور زدوکوب کو وتیرہ بنالے تو نونہال وطن کا علم حاصل کرنے کا شوق زیرزمین چلا جائے گا اور بے جاسختی اس کی زندگی کی تعمیر میں سدسکندری ثابت ہوگی۔اس کے علاوہ جانبیں کی طرف سے ملنے والی شفقت اس کے کردار کی تعمیر میں احسن کردار ادا کرے گی۔اور اس کو معاشرے کا اہم رکن بنانے میں سنگ میل ثابت ہوگی۔ہماری حکومت کی ''مارنہیں پیار'' کی پالیسی کو ارباب علم ودانش نے تعلیم وتعلم کے شعبے میں اہم قدم قرار دیا ہے۔اور کہا ہے کہ اس پالیسی کے تحت حاصل کیا جانے والا علم لازوال ہوگا اور ملک وقوم کی ترقی میں اہم کردار ادا کرے گا۔''مارنہیں پیار'' ایک عظیم پیش رفت ہے اور اس کی خالق سابقہ حکومت کے ساتھ حکومت وقت بھی مبارکباد کی مستحق ہے۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں ، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

☆☆☆☆☆☆☆

شرح خواندگی اور معاشی خوشحالی

پڑھو گے، لکھو گے بنو گے نواب
جو کھیلو گے، کُودو گے، ہو گے خراب

خواندن مصدر ہے اور اس کے معنی و مفہوم پڑھنے کے بارے میں ہے۔ اور معاشی خوشحالی سے مراد یہ ہے کہ انسان معاشی لحاظ سے خوش حال ہو، ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سفر و حضر ایک معیاری قسم کا ہو، ان کے رہن سہن، چال ڈھال میں ایک پر مسرّت اور خوشحال انسان کی جھلک نمایاں ہو۔ معاشی طور پر خوشحال انسان ہی اپنے بارے، اپنی اولاد کے بارے میں، اپنے خویش و اقارب کے بارے میں، اپنے احباب کے بارے میں مثبت سوچ کا حامل ہوسکتا ہے، اور اس معاشی خوشحالی کے لیے ایک انسان کا رشتہ تعلیم سے استوار ہونا انتہائی ناگزیر ہے۔

تعلیم انسان کو ایک عظیم انسان بناتی ہے، ایک صاحب شعور فرد بناتی ہے، تعلیم سے روشنی میسر آتی ہے، علم ایک ایسا نور اور روشنی ہے جس سے جہالت کے اندھیرے دور ہوتے ہیں، انسان کے دل و دماغ عرفان و آگہی کے نور سے منور ہوتے ہیں، علم ہی کی بدولت انسان حق و باطل اور خیر و شر میں فرق کرنا سیکھتا ہے۔ علم ہی کی بدولت انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور علم ہی کی وجہ سے انسان کے رہن سہن اور طرزِ زندگی میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں تعصب اور تنگ نظری کی بجائے فراخ دلی اور رواداری، خودغرضی کی بجائے ایثار، غرور و نخوت کی بجائے عجز و انکسار، حرص اور لالچ کی بجائے صبر و قناعت، حسد اور نفرت کی

بجائے محبت اور اخوت جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

تعلیم ہی کے ذریعے مرصعّ انسان ہی معاشی خوشحالی کا ضامن ہوتا ہے، اگر کسان پڑھا لکھا ہوگا تو اس کی کھیتی بھی زیادہ ہوگی، اس کی فصل میں اضافہ ہوگا، اس کھلیان وکھیت کشت زعفران کا نمونہ پیش کریں گے۔ جدید مشینری سے آگاہی کی بدولت اس کی تمام فصلیں زیادہ مقدار میں ہوگی۔ اور اس طرح یہ چیز اس کی خوشحالی اور معاشی طور پر اس کو مضبوط کرنے کا سبب بنے گی۔ صنعتکار، تاجر، آجر، طبیب، واعظ اگر واقعی زیورِ علم سے آراستہ ہوں گے تو معاشی خوشحالی کی بادِ نسیم کے جھونکے فضاء کو مسلسل معطر کرتے رہیں گے۔ ان کے گھر کی چار دیواری، گھر کا ماحول، گھر کی تہذیب سب خواندگی کی بدولت اعلیٰ نمونہ پیش کریں گے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کا رویہ اور ناخواندہ شخص کا رویہ، ایک تعلیم یافتہ شخص کی اولاد اور ایک ان پڑھ شخص کے بچے ایک تعلیم کے زیور سے مزیّن شخص کی نشست و برخاست اور ایک گنوار اور اجڈ شخص کا قیام وقعود سب الگ الگ ہیں اور ان میں بعدالمشرقین ہے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ شرح خواندگی میں اضافہ کیا جائے تاکہ عام شخص اپنی حیثیت کو معیاری انداز میں برقرار رکھ سکے۔ تعلیمی اداروں میں ایک غریب شخص کا داخلہ فری کیا جائے، وردی، اور ماہانہ فیس برائے نام کی جائے، (جو حکومت پاکستان بالخصوص حکومت پنجاب اس وقت کر رہی ہے اور یہ ایک شاندار اقدام ہے) اس کو مزید بڑھایا جائے۔ تعلیمی تفاوت ختم کیا جائے۔ تعلیم بالغاں کے لیے بھی ادارے کھولے جائیں۔ دینی اداروں کی بھی مدد کی جائے اور ان کو بھی جدید اور قدیم علوم کی تدریس کی تلقین کی جائے۔ یہ جملہ اقدام معاشرے کے جملہ افراد کو نہ صرف معاشی بلکہ اقتصادی، روحانی اور سیاسی طور پر بھی مضبوط کر سکتے ہیں۔ اور اس میں ہی ہماری معاشی خوشحالی کا راز مضمر ہے۔ شرح خواندگی میں اضافہ ہی معاشی طور پر ہمیں خوشحال کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

توانائی اور ملکی ترقی

توانائی سے مراد طاقت ہے، اور پوری عالمی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ قوم اس وقت تک ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے جسم و جاں میں قوت پیدا نہ کرے کیونکہ حرکت میں برکت ہے اور حرکت کے لیے توانائی کی ضرورت ہے۔ دنیا کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے لیے مناسب قوت اور طاقت فراہم نہ کی جائے۔ آنکھ کے جھپکنے سے لے کر پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے تک جملہ امور بغیر طاقت اور توانائی کے سرانجام نہیں دیے جا سکے۔

ملکی ترقی سے مراد پاکستان کی ترقی ہے، پاکستان ہمارا وطن ہے، پاکستان ہمارا دیس ہے، پاکستان ہماری آن ہے، اور اسی سے ہی ہماری شان ہے، اس کی آن، بان اور شان ایسی صورت میں برقرار رکھی جا سکتی ہے کہ شب و روز ایک کر کے اس کی تعمیر و ترقی میں ہر ایک ''ہر کس بقدر، ہمّت اوست'' کے تحت اپنا اپنا حصہ شامل کرے، معلم ہے تو وہ طلباء کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے، متعلم ہے تو وہ اپنے آپ کو مطالعہ کے لیے وقف کر کے اس کی ترقی کے لیے توانائی کے اسباب بہم پہنچائے۔ کیونکہ توانائی کوئی ایسی غیر مرئی چیز نہیں ہے کہ انسان کو علم بھی نہ ہو اور ملک ترقی کرتا جائے۔ توانائی اور عوام النّاس لازم و ملزوم ہیں۔ انسان کا ہاتھ حرکت کرے تو توانائی پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا دماغ حرکت کرے اور توانائی کی پیداوار میں اپنا اپنا حصہ شامل کرے تو توانائی کی پیداوار میں اضافہ شروع ہو جاتا

ہے۔ پاکستان کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے بڑے بڑے دماغ جب حرکت میں آتے ہیں تو مختلف شعبوں میں ترقی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

توانائی اور ملکی ترقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے اندر ہونے والی ترقی کا راز صرف اور صرف عوام النّاس کی مثبت سوچ میں مضمر ہے۔ ان کے اپنے ملک کے لیے خلوص میں مضمر ہے، ان کی تگ و دو اور انتھک جدوجہد میں چھپا ہوا ہے۔ آج اگر ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو جائے تو غفلت اور تساہل پسندی کو چھوڑنا ہوگا۔ بیکار پن اور فرصت کے لمحات کو بھی ضائع کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔ ہمارا ملک دیگر ممالک کی نسبت پسماندہ اور ترقی پذیر کیوں ہے؟ اس کا سبب صرف اور صرف توانائی کی گھمبیر صورتِ حال ہے۔ مختلف مدّات سے حاصل ہونے والی اس کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے ناکافی ہے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ترقی کی منازل طے کرنے کے لیے توانائی کے اسباب تلاش کرنا ہوں گے۔ کھیتوں اور کھلیانوں کو کشتِ زعفران بنانے کے لیے، فضاء میں پرواز کرنے کے لیے، اپنے گلی کوچوں کو قمقموں سے روشن کرنے کے لیے، فصلوں کی کاشت اور پھر مناسب برداشت کے لیے، اپنی برآمدات میں اضافے کے لیے، نیز انسان کا معیارِ زندگی بہتر بنانے کے لیے، توانائی کی اہمیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

توانائی چونکہ کی ترقی کی ضامن ہے۔ اس لیے اس کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ وہ مقام جہاں پریشانیاں ہی پریشانیاں ہوں، مشکلات کے انبار ہوں، مہنگائی کا عفریت ہولناک صورت میں موجود ہو، گرانی کا اژدہا پھن پھیلائے بیٹھا ہو، تعلیم کے مسائل ہو، تربیت کا فقدان ہو، لوگ غربت کی لکیر کو ٹچ کر رہے ہوں، وہاں جملہ مسائل کو حل کرنے کے لیے انتھک کوشش کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

فرقہ بندی مسلمانوں کے لیے بڑا چیلنج ہے

اسلام کے پیروکار، اسلام کے ماننے والے، اسلام کے علمبردار صرف اور صرف مسلمان ہی ہیں اور مسلمان ہی اس کے صحیح طریقے سے ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اس کے دنیاوی واُخروی ثمرات سے کماحقہٗ دیگر اقوام کے قلوب واذہان کو آشنا کر سکتے ہیں۔ اس خوف کے پیش نظر غیر مسلم اقوام نے ان کے ذہن کو پراگندہ، ان کے پیروکاروں کو منتشر کرنے کا عزم صمیم کر رکھا ہے، وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ اسلام کے ماننے والے دنیا سے ناپید ہو جائیں اور دیگر غیر مسلم اقوام کامیاب وکامران ہو جائیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اسلام کے وجود اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے یہودی ازم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے، لوگوں کو ورغلایا گیا، بہکایا گیا، شیطانی طاقتوں نے مختلف طریقوں سے اسلام دشمن رویوں کو مرصّع اور مزیّن کر کے پیش کیا۔ ان سب میں سب سے زیادہ زور انہوں نے فرقہ واریت والے چنیل پر لگایا، اور کوشش کی کہ اس طرح ان کی قوت کو نہ صرف کمزور کیا جا سکتا ہے بلکہ صفحۂ ہستی سے بھی مٹایا جا سکتا ہے۔

فرقہ واریت ایک ایسا زہر ہے کہ جس کا اثر فوری ہوتا ہے اور تریاق پہنچنے سے پہلے پہلے اس کا اثر داعیٔ اجل کو لبیک کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس ناسور نے مسلمانوں کی دینی صحت کو برباد

کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے، فرقہ واریت کے اژدہانے اسلام کے پیروکاروں کو مختلف انداز میں ڈسنا شروع کیا ہوا ہے۔ اس کے معاشرتی، معاشی اور دینی رجحانات میں یکسر تبدیلی آ گئی ہے۔ معاشرے کے حسن کا چاند گہنا گیا ہے، گھر کے آنگن میں فرقہ واریت کے اندھیرے چھا گئے ہیں، فرقہ واریت کے بوم نے شجرِ اسلام کو منحوس بنا دیا ہے۔

فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ فرقہ وارانہ رجحانات کو ختم کرنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ قوتِ برداشت پیدا کی جائے، خطباء منبروں پر ناصحانہ انداز اختیار کریں۔ معلم دوران تدریس فرقہ وارانہ رجحانات سے گریز کرے، ہر میدان میں فرقہ واریت کی حوصلہ شکنی کی جائے، اگر ہم اس انداز سے طرز زیست اپنائیں تو معاشرے میں ہم آہنگی کی فضاء پیدا ہو سکتی ہے اور دشمنانِ اسلام کی دلی آرزو بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ نظریاتی اختلاف ایک بدیہی امر ہے۔ تاہم قوت برداشت کو پیش نظر رکھا جائے تو فرقہ بندی کے چیلنج سے بڑے احسن طریقے سے نمٹا جا سکتا ہے۔ بقول اقبال:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆

کھیل اور علمی درسگاہیں

شیر خوار سے نونہال اور نونہال سے نوجوان اور نوجوان سے رجل رشید بنتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے پہلے بچہ پھر لڑکا اور پھر عفوان شباب کے گلستان میں گل چینی کرنے والا معرض وجود میں آتا ہے۔ اور اس طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے، اور پھر عالم برزخ سے گزرتا ہوا اپنے اصلی مقام کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ اس مختصر سے وقفے کو پر مسرّت اور خوشیوں بھرا بنانے کے لیے ہر معاشرہ مستعد نظر آتا ہے۔ اور اپنے نونہالوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے لیے تعلیمی اداروں کے قیام کو یقینی بناتا ہے۔ اگر چہ تعلیمی ادارے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے جزو لاینفک ہیں لیکن تعلیمی اداروں میں کھیلوں کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان کی موجودگی طلباء کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔

تعلیمی اداروں میں کھیلوں کی اہمیت اظہر من الشّمس ہے کھیل طلباء کی صلاحیت کو نکھارتے ہیں، طلباء کے شعور کو جلا بخشتے ہیں، طلباء میں کام کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے، طلباء میں محنت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اُن کی نجی زندگی میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے، اُن کی دماغی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے، ان کی تعلیمی اوقات میں سستی و کاہلی بھی عنقا ہو جاتی ہے۔ کھیل طلباء میں جذبہ مسابقت پیدا کرتے ہیں، برداشت کی قوت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے جو ان جملہ امورِ حیات میں باعث تسکین بنتا ہے۔

جو لوگ اپنے تعلیمی اداروں میں کھیلوں کی اہمیت سے آشناء ہیں وہ ہمیشہ اُن تعلیمی

اداروں میں اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں جن میں کھیل کے میدان ہوتے ہیں، جن میں فزیکل انسٹرکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو بچے کھیل کے متعین کردہ اوقات میں اپنی حاضری یقینی بناتا ہے وہ کمرۂ جماعت کے علاوہ کمرۂ امتحان میں بھی سرخرو ہوتا ہے اُس کی کاہلی اسباق کی تیاری میں سدراہ ثابت نہیں ہوتی، اس کی جسمانی ساخت متوازن ہوجاتی ہے، اس کی صحت دیگر طلباء کی نسبت معیاری ہوتی ہے۔ بیماری اور مرض اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں، آب و ہوا کی تبدیلی اُس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اُس کی سالانہ کارکردگی معیاری ہوتی ہے، اُس کے تعلیمی ریکارڈ میں کھیلوں کے میڈل اور تمغے بھی ہوتے ہیں جو معاشرے میں معیاری زندگی گزارنے میں اس کا دست راست ثابت ہوتے ہیں۔

کھیل کی اہمیت کو اپناتے ہوئے حکومت وقت نے اس طرف خاصی توجہ دی ہے، ابتدائی مدارس سے لے کر جامعات کے طلباء کو کھیل کے مواقع فراہم کر دیئے گئے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں باقاعدہ ٹورنامنٹ منعقد کیے جاتے ہیں۔ کامیاب کھلاڑیوں میں انعامات دیئے جاتے ہیں اور اُن کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ناکام کھلاڑی آئندہ فتح کی اُمید کے لیے تازہ دم ہونے کے لیے دوبارہ پریکٹس شروع کر دیتے ہیں۔ کھیل نہ صرف علاقائی سطح پر کھیلے جاتے بلکہ ملکی اور بین الاقوامی مقابلہ جات بھی ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں کھیل سے وابستہ رہنے والے طلباء ضلعی اور ڈویژن و ملکی سطح کے علاوہ بین الاقوامی سطح کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اپنی قوم کا نام روشن کرتے ہیں۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ جس ملک کے کھیل کے میدان آباد ہوتے ہیں وہاں کے ہسپتال ویران ہوتے ہیں۔ کھیل سے وابستہ رہنے والے طالب علم کی صحت کا ہما ہمیشہ محو پرواز رہتا ہے اور کھیل سے عدم دلچسپی رکھنے والے طلباء کے آنگن میں نحوست اور مایوسی کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔ کھلاڑی کی ضرب اسے کسی وقت بھی روحانی، دماغی اور جسمانی طور پر نقطہ عروج پر پہنچا سکتی ہے۔ وہ ایک گیند کو ضرب نہیں لگا رہا ہوتا بلکہ اس کا دماغ فتح و کامرانی سے ہمکنار ہو رہا ہوتا ہے۔ کھیل کی اہمیّت کے پیش نظر اس کی اشرافیہ ہر سطح پر سرپرستی کرے اور یہی وقت کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تعلیمی اداروں میں کھیلوں کی اہمیت

تعلیمی اداروں کا وجود ایک صحت مند معاشرے کے قیام اور اس کو استحکام بخشنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ ترقی یافتہ اقوام کی ترقی اور عروج تعلیمی اداروں کا مرہونِ منت ہے۔ جن ممالک کے تعلیمی ادارے فعّال کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں اُن کی افرادی قوت مضبوط ہوتی ہے۔ اُن کے افراد سطحی سوچ کے حامل نہیں ہوتے، اُن کے فکری، نظری، روحانی، جسمانی قویٰ کبھی کسی ضعف اور نقاہت کا شکار نہیں ہوتے، جس طرح تعلیمی اداروں کا وجود اہم ہے اسی طرح اس میں وقوع پذیر ہونے والی جملہ سرگرمیاں بھی اہم ہیں اور بالخصوص کھیلوں کی اہمیّت تو تعلیمی اداروں میں اور بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ صحت مند جسم اور صحت مند دماغ کے لیے یہ بڑا واضح کردار ادا کرتی ہیں۔

تاریخ اقوام عالم پر نظر دوڑائیں تو کاروبار اور محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ ایسے لمحات بھی نظر آتے ہیں جن میں تفریح اور کھیل کود کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اپنے متعین کردہ اوقات میں وہ صرف اور صرف کھیل کود اور تفریحی پروگراموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کھیل کود کا تصور جس طرح دیگر مذاہب میں موجود ہے اسی طرح وُہ اسلام میں بھی موجود ہے، محسنِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی تیراکی اور دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ کھیل اور تفریحی پروگرام کردار پر بڑا اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے نظامِ تعلیم میں کھیل کا تصور کلیتًا موجود ہے۔ اوقاتِ تعلیم و تدریس میں باقاعدہ ڈرل کے نام سے کھیل کا ایک پیریڈ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ جس میں طلباء کو فزیکل انسٹرکٹر مقررہ مشقیں کرواتا

ہے۔طلباء ذہنی آسودگی محسوس کرتے ہیں اور دن بھر کی رطب و یابس سماعتوں سے گزرنے والا دماغ دوبارہ ذہنی مشقت برداشت کرنے کے لیے مستعد ہوجاتا ہے۔بقول شاعر:

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

کھیل انسان میں اچھی خصوصیات پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں، کھلاڑی نظم وضبط کی پابندی کرتا ہے، ڈسپلن اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے، قوت برداشت کی صفت سے متصف ہوجاتا ہے۔ذہنی ہم آہنگی، شائستگی اور جذبۂ مسابقت اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔

مختلف ممالک کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کریں اور نظام تعلیم کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لیے بنائی گئی تعلیمی پالیسیوں کے قراطیس کا اگر بنظرِ غائر مشاہدہ کریں تو یہ بات آفتابِ نصف النہار کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ان میں شرح خواندگی کے اضافہ کا سبب کھیل کے میدان ہیں جوانہوں نے اپنے طالب علم کے لیے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

طالب علم کمرۂ امتحان میں پہنچنے کی تیاری کمرۂ جماعت سے ہی شروع کردیتا ہے۔کبھی اس کو سائنس کی خشک اصطلاحات یاد کروائی جاتی ہیں، کبھی اس کو فزکس، کیمسٹری کے فارمولے یاد کروائے جاتے ہیں، کبھی اس کو الجبرے کے کلیے اور انگریزی کی فارمیں یاد کروائی جاتی ہیں، لیکن ان جملہ اصطلاحات کو ازبر کرنے، ان جملہ سائنسی قوانین کو حفظ کرنے اور کماحقہٗ نصاب پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے صحت مند دماغ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔جس طرح دماغ کو خشکی سے محفوظ رکھنے اور طراوت پہنچانے کے لیے مرغن غذاؤں اور مقوی مغزیات کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اسی طرح جسم اور دماغ کو صحت منداور چاک وچوبند رکھنے کے لئے کھیل کود کی افادیت بھی مسلمہ ہے۔مثل مشہور ہے کہ جس ملک کے کھیل کے میدان آباد ہوتے ہیں وہاں کے ہسپتال ویران ہوتے ہیں۔

جہاں تک تعلیمی اداروں میں کھیل کی اہمیت کا تعلق ہے وہ نہ صرف یہ کہ دنیاوی تعلیم میں کھیلیں شامل ہیں بلکہ دینی ادارے اور درسگاہیں بھی اس کی معترف ہیں بلکہ منتظمین اور مہتمم حضرات خود بھی فارغ اوقات میں کھیلتے ہیں اور طلباء کی دماغی توانائیوں میں اضافہ کے لیے انہیں اپنی نگرانی میں کھیلنے کی ترغیب دیتے ہیں نیز کھیل میں حصہ لینے کے لیے ان کا خود شامل

ہونا اُن کے طلباء کے لیے مہمیز ثابت ہوتا ہے۔

تعلیمی اداروں میں ہر سال ٹورنامنٹس کروائے جاتے ہیں، مختلف گیمز ہوتی ہیں اور پھر ازاں بعد متعلقہ محکمہ کے افسران انہیں انعامات سے نوازتے ہیں۔ اور شکست خوردہ ٹیمیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی بجائے آئندہ سال پروگرام میں شمولیت کے لیے شروع سال سے ہی تیاری شروع کر دیتی ہیں۔ ہر شخص اس بات کا معترف ہے کہ صحت مند فرد، صحت مند معاشرہ اور صحت مند قوم کے لیے کھیل کے میدان ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تندرست وتوانا جسم ہی ہر میدان میں کامیابی اور کامرانی کے جھنڈے لہراتا ہے۔ اسلام میں بھی صحت مند جسم کے حامل افراد عظیم مرتبے والے گردانے جاتے ہیں، عظمت کی معراج پر فائز ہونے کے لیے صحت مند دماغ اور صحت مند جسم ہر مکتب فکر کے لوگوں کی ضرورت رہی ہے۔ آج ہمارے تقریباً 57 مسلم ممالک ہیں۔ اور ان کی سرد مہری اس بات کی غمّاز ہے کہ وہ جملہ سرگرمیوں جو عالمی سطح پر وقوع پذیر ہوتی ہیں سے بیگانہ و بے نیاز ہوتے ہیں، یہ ان کے جسمانی اور دماغی نقص کی بیّن دلیل ہے کہ اس اکثریت کے باوجود وُہ اسلام کی کوئی خدمت نہیں کر رہے اور لادینی طاقتوں کے زیر تسلّط زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ آج اگر وہ ہمارے حکمرانوں کی طرح چشم بینا وا کریں اور اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں سپورٹس پروگرام کا اجراء کریں تو ایک **العقل السلیم فی الجسم السلیم** والی حدیث کو عملی جامہ پہنایا جا سکے گا اور دوسرا آنے والی نسل مثبت سوچ کی حامل ہوگی جو مسلم دنیا کے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ سے کم نہ ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

نظم وضبط

تنظیم بڑی چیز ہے اے اہلِ گلستاں
بکھرے ہوئے تنکوں کو نشیمن نہیں کہتے

کائنات جن اٹل اصولوں پر چل رہی ہے ان میں زیادہ اہم قانون نظم وضبط کا ہے۔ کائنات کی لامتناہی اور بے کراں وسعتوں میں کوئی معمولی سی شے یا کوئی حقیر سا ذرّہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں، نظامِ قدرت کے تحت مختلف مخلوقات کو جو ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں وہ انہیں بطریقہ احسن انجام دے رہی ہیں۔ نظامِ شمسی کے اندر مختلف ستاروں اور سیاروں کی حرکت اور گردش کا جو قانون خالقِ کائنات نے مقرر کیا ہے۔ اس پر صحیح طریقے سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔ زمین اپنے مقررہ ضابطے کے تحت محوِ گردش ہے۔ اسی طرح فضاؤں، بادلوں کا سفر، دریاؤں اور نالوں کی روانی، طغیانی، پہاڑوں کی آتش فشانی اور سمندر کے مدّ و جزر وغیرہ کے جو اصول اس حکیم مطلق نے مقرر کیے ہیں یہ سب چیزیں انہی قوانین کے مطابق کام کر رہی ہیں۔

قدرت کا تکوینی نظام (جو نظم وضبط کی بنیاد پر قائم ہے) انسان کی نظم وضبط کی اہمیت کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ کائنات کی مختلف اشیاء ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ قواعد وضوابط کی خلاف ورزی بہر حال نقصان دہ ہے۔ پانی کی مثال ہی لیجئے اگر پانی کی روانی کے لیے شہر کی حدود مقرر نہ کر دی جائیں تو وہ کناروں کو توڑ کر اِدھر اُدھر پھیل کر تباہی مچا دیتا ہے۔ لہذا اسے نظم وضبط کے حصار میں رکھنا انتہائی ضروری ہے اگر ہم غور کریں تو یہ بات سمجھ لینا

کچھ مشکل نہیں کہ نظم وضبط اپنانے ہی سے سکھ اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کی آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

نظم وضبط اچھی زندگی گزارنے کی بنیادی شرط ہے اس لیے اسلام نے اس اصول کی پابندی پر بڑا زور دیا ہے۔

☆ تمام مسلمان اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور آپس میں اختلاف نہ کریں۔ (القرآن)

☆ بلاشبہ وہ لوگ خدا کے محبوب ہیں جو اللہ تعالی کی راہ میں استقلال کے ساتھ صف باندھے لڑتے رہتے ہیں گویا وہ سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (القرآن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نظامِ حکوت چلانے والے امیر کی اطاعت کرو خواہ وہ نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ (الحدیث)

اسلام کے تمام احکام میں نظم وضبط کی روح کارفرما ہے، اسلام اپنے پیروکاروں سے زندگی کے عام معمولات میں بھی نظم وضبط کے اس مظاہرے کا مطالبہ کرتا ہے مسلمان کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک انہوں نے اپنے آپ کو منظّم ومتحد رکھا ساری دنیا ان کے سامنے سرنگوں رہی لیکن جب اِن کے اندر انتشار، افراتفری اور افتفر اق پیدا ہوا تو ان کی حیثیت اور وقعت ختم ہوکر رہ گئی۔ اس وقت جو قومیں دنیا کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ قومی اعتبار سے ان کے اندر زبردست نظم وضبط موجود ہے۔ یہودی دنیا کا زیادہ ذلیل اور منتشر گروہ تھا مگر انہوں نے اپنے آپ کو منظّم کیا اور اپنی قومی ریاست ''اسرائیل'' قائم کر لی۔ آج عربوں کے مقابلے میں اسرائیلوں کی برتری کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ یہودی منظّم ہیں اور عرب منتشر ہیں۔

نظم وضبط کی اہمیت کا اندازہ ہم اپنی معاشرتی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی کر سکتے ہیں فوج کی تمام قوت کا راز نظم وضبط میں ہے جس فوج کا نظم وضبط کمزور ہو جائے وہ اپنی عددی برتری اور اسلحے کی فراوانی کے باوجود دشمن کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ جنگِ اُحد میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان مجاہدوں کے ایک گروہ کو ایک دُرّے پر متعین کیا تھا مگر انہوں نے نظم وضبط میں سستی کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بھاری نقصان

اٹھانا پڑا۔آج ہمیں نظم وضبط کے فقدان کے سبب ہی قومی سطح پر بے شمار مشکلات ومصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے قوم کو جن تین اصولوں (تنظیم، اتحاد، یقین محکم) کی تلقین کی تھی۔ان میں اوّلین اصول ''تنظیم'' ہے۔

نظم وضبط کی عادت اپنانا، نظم وضبط کے تحت اپنے اوقات کار کا تعیّن کرنا، نظم وضبط کے تحت زندگی گزارنے کا شیوہ بنانا ہماری ذاتی سلامتی، اور ہمارے ملک کی سلامتی کا ایک ناگزیر تقاضا بھی ہے۔جنگ اور قومی زندگی کے دوسرے نازک مواقع پر ڈسپلن کا فقدان ہمیں ہلاکت اور تباہی سے دوچار کرسکتا ہے۔

حشرات الارض اور مور ومگس کا قطار کے اندر چلنا، آسمان کی بلندیوں پر طائران خوشنوا کی اجتماعی پرواز، اونٹوں کی بغیر حدی خواں کے لمبی لمبی قطاریں ہمیں یہ درس دے رہی ہیں کہ نظم وضبط زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

بے شُبہ ناکام اس دنیا میں جو انسان ہے
لامحالہ اس میں نظم و ضبط کا فقدان ہے

☆☆☆☆☆☆☆

میری جان پاکستان

محبت کی زباں میرا وطن ہے
وفا کی داستاں میرا وطن ہے

زندگی تو جیسے بھی ہوگزر جاتی ہے، سورج آگ برسا رہا ہو، موسم سرما کی یخ بستہ ہوائیں شدت کی سردی کا سبب بن رہی ہوں، موسم بہار میں گلستان کے گلہائے رنگارنگ خوبصورتی بکھیر رہے ہوں۔ ہرلمحہ ہرآن زندگی کا ہامحو پرواز رہتا ہے، لیکن وہ شخص قابل صد افتخار ہے جو زندگی کی بوقلموینوں سے محبت و پیار سے نبرد آزما ہوتا ہے، اور محبت و پیار کی پتنگیں اُس وقت تک نہیں چڑھائی جاسکیں گی جب تک ماحول خوشگوار نہ ہو اور انسیت بھری فضاء نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکستان کی صورت میں نعمت غیر مترقبہ سے نواز رکھا ہے۔ اس سے محبت ہمارا نہ صرف طبعی تقاضا ہے کہ ہمارے عزیز و اقارب یہاں رہائش پذیر ہیں، ہماری سانسوں کی یہاں آمد و رفت ہو رہی ہے، اس کے شجر، اس کے حجر ہماری زندگی میں ایک اہم اور فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ فرمانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''حب الوطن من الایمان'' وطن سے محبت ایمان کا حصہ بھی ہے۔ ہمارے تو ایمان کی تکمیل ہی وطن سے محبت میں مضمر ہے۔ اگر محبت اور پیار ہے تو ایمان مکمل ہے، اگر وطن سے پیار اور محبت نہیں ہے تو دعویٰ ایمان حقیقت

سے یکسر خالی ہے۔

میں کیوں نہ کہوں کہ پاکستان میری جان ہے، میری آن ہے، میری شان ہے۔ انسان اس فانی زندگی میں بھی اپنی جان سے بڑھ کر محبت اور پیار کرتا ہے، جان کی حفاظت بھی ایمان کی ضروریات میں سے ہے۔ کیونکہ جان سلامت ہے تو پھر ایمان بھی سلامت ہے۔ اور جان کے تحفظ کے لیے مکان کی ضرورت ہے اور مکان کے لیے قطعہ ارضی کی ضرورت ہے اور قطعہ ارضی اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکستان کی صورت میں عطا فرمایا ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان سے محبت کے کھوکھلے نعرے لگانے کی بجائے عملی مظاہرہ کیا جائے۔ کرپشن، اقربا پروری، رشوت ستانی، ڈاکہ زنی، دہشت گردی، کساد بازاری، رہزنی، اور چوری جیسی ناگفتہ بہ برائیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شب و روز کاوش کی جائے گی تو پھر اصل میں ''میری جان پاکستان'' کا تصور ابھر کر سامنے آئے گا۔ ورنہ کاغذ کے پھول سے خوشبو کی توقع عبث ہے۔

میری جان پاکستان کے الفاظ اگر طالب علم کی زبان پر ہیں تو وہ اپنی تعلیم میں دل لگی سے ان الفاظ کو حقیقت کا جامہ زیب تن کروا سکتا ہے، اگر یہی الفاظ کسی تاجر نے استعمال کیے تو وہ تجارت کو اسلامی خطوط پر استوار کر کے حقیقی محبت کا اظہار کر سکتا ہے، اگر پاکستان میری جان کا لفظ ایک خطیب کی زبان پر آ گیا ہے تو وہ برسر منبر وعظ و نصیحت کر کے اس کو حقیقت کا روپ دے سکتا ہے۔ اگر یہ لفظ کسی قانون دان یا منصف کی زبان سے ادا ہو رہا ہے تو یہ انتہائی ناگزیر ہے کہ وہ انفرادی عدل وانصاف کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی عدل وانصاف کے تقاضے بھی پورے کرے۔

پاکستان میری جان ہے، یہ اپنے وطن سے محبت کی علامت آج ہم اگر اپنے وطن کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے ہر میدان میں کام کرنا ہوگا۔ اس میں اخوت و ہمدردی کی فضاء کو پروان چڑھانا ہوگا، اس کے آنگن میں فصل بہار کے مسحور کن جھونکوں کا ڈیرہ جمانا ہوگا۔ اس کے گلشن میں ایثار و قربانی کے گلوں کی آبیاری کرنا ہوگی۔ اس کے پہاڑوں کے لیے جوئے شیر لانے والے فرہاد کا کردار ادا کرنا ہوگا، اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا ہوگا۔ قائداعظم کی جہد مسلسل سے حاصل کیا جانے والا یہ عظیم ملک اور ہزاروں قربانیوں سے وجود میں آنے والی یہ ارض پاک ہمیں واقعی جان سے

زیادہ عزیز ہے، اور پھر ہم کیوں نہ کہیں کہ میری جان پاکستان ہے۔اس کے پتھر، اس کے حجر، اس کے کھیت وکھلیان، اس کے بحر و بر، اس کے طائر خوش الحان اس کے واعظِ شیریں بیان سب کے سب مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

☆☆☆☆☆☆☆

کتاب بہترین دوست

کتاب ایک بہترین دوست ہے، دوست سے کبھی کبھار دھوکے اور فریب کاری کا امکان رہتا ہے لیکن کتاب کی دوستی سے اس قسم کے امکان کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ کیونکہ جو خلوص اور محبت اس نے فراہم کرنی ہے اس میں کسی موقع پر جا کر تبدیلی کی گنجائش یا کمی نہ ہوگی۔ کتاب کی رفاقت ایک ایسی ہم نشینی ہے کہ جو اپنے رفیق کو کبھی خلوت کا شکار نہیں ہونے دے گی۔ یہ اپنے ہم نشین کے دل میں خلوتوں اور تنہائیوں کی وحشت کو ختم کر کے محبت ومودت کے شگوفے کھلاتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے تاریخ عالم لکھنے کا موقع ملتا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال سے شناسائی ہوتی ہے۔ قوموں کی معاشی ، روحانی ، اقتصادی اور سیاسی حیات کے خدوخال سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

تاریخ اسلام اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمان کو کتب بینی ومطالعہ میں ہمیشہ ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے، اہل اسلام ہمیشہ کتابوں سے محبت کرتے آئے ہیں، دسمبر کی زمستانی ہوائیں ہوں یا جون کی تڑپا دینے والی دھوپ، وقت عصر ہو یا رات کا پچھلا پہر، تدریسی اسباق کی تیاری ہو یا سفر آخرت کی تیاری، کتب ہائے خیر سے ذی شعور اور ذی فہم وفراست افراد کی دوستی مثالی رہی ہے۔ کتاب سے دوستی مراد علم دوستی ہوتی ہے اور علم دوست انسان گلستانِ ہستی کے رنگا رنگ پھول، صحت مند معاشرے کے ماتھے کا جھومر، بیمار انسانیت کے مسیحا، مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے والے لوگوں کے لیے رافت و رحمت اور جہالت کے بحر بیکراں میں

ہچکولے کھاتی ہوئی ناؤ کے ناخدا ہوتے ہیں۔

کتاب سے دوستی جینے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ کتاب سے دوستی قوموں کی زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہی کرتی ہے۔ ایک اچھی کتاب انسان کی مشکلات میں اس کی مدد کرتی ہے اور پریشانیوں میں اس کی دلداری کا سامان بہم پہنچاتی ہے، افکار وآلام کے ہجوم میں کتاب انسان کے ذہنی سکون اور تفریح طبع کا بہترین ذریعہ ہے۔ معروف انگریز مصنف سمرسٹ باہم کا خیال ہے کہ مطالعہ کی عادت اختیار کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے گویا دنیا جہان کے دکھوں سے بچنے کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تیار کر لی ہے۔

کتب بینی کا خوگر علم دوست بھی ہوسکتا ہے۔ کتب بینی سے قاری کی گود علم ومعرفت کے خزانوں سے بھر جاتی ہے۔ اس کا دامن دانش وآگہی کے آب زلال سے تر ہو جاتا ہے، اس کی دوستی اسے ابدی زندگی بخشتی ہے۔ بہترین کتاب آخرت کی تیاری میں مدد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ کتاب کا مطالعہ کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مطالعہ کا مشغلہ انسان کے لیے نفاست، نظافت، لیاقت اور عبادت کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ مطالعہ کا عادی شخص کئی خباثتوں سے محفوظ رہتا ہے۔

کتب بینی ذہنی تسکین کے علاوہ انسانی قلب ودماغ کو بھی منور کرتی ہے، کتابیں ہمیں بصیرت عطا کرتی ہیں، خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ علم میں اضافہ ہوتا ہے عقل ودانش کی تکمیل ہوتی ہے، اصلاح اخلاق ہوتی ہے۔ کتاب ایک ایسی معلم ہے جو بلا معاوضہ اور بلاخوف وخطر انسان کو تعلیم دے کر اس کے ذہنی افق کو روشن اور وسیع کرتی ہے جس کسی نے کتاب سے دوستی کی کتاب نے اس کا حق ادا کر دیا۔ ابنِ خلدون نے کتاب سے دوستی کر کے مقدمہ ابنِ خلدون تصنیف کی، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، محی الدین ابنِ عربی، داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جیسے سلف صالحین نے کتابوں سے ناطہ جوڑا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے مقام اور مراتب ودیعت فرمائے کہ یہ نابغۂ روزگار ہستیاں آسمان علم ودانش پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکیں۔ کتاب فی الحقیقت ایک بہترین دوست ہے بشرطیکہ معیاری ہو۔

ہم نشینی اگر کتاب سے ہو

اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں

☆☆☆☆☆☆☆

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

زندگی تو گزر جاتی ہے، جو زندہ ہے اُس نے بالآخر سفرِ آخرت کرنا ہے، جو سانس لے رہا ہے اُس نے جان، جانِ آفریں کے سپرد کرنی ہے، کوئی بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے، کوئی کسی ڈوبنے والے کو سہارا دیتے ہوئے خود لہروں کے سپرد ہو جاتا ہے۔ کوئی مزمّن بیماری کا شکار ہو کر حکیموں اور ڈاکٹروں کے نسخے استعمال کرتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہہ دیتا ہے۔ کوئی راہزن کے ہتھے چڑھ کر اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی زوجہ کو بیوہ کر جاتا ہے۔ لیکن قابلِ صد افتخار ہیں وہ لوگ جو ملک و ملت کی خاطر سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دشمنوں کی توپوں کا نشانہ بنتے ہیں اور جامِ شہادت نوش کر لیتے ہیں۔ شہید کو قرآنِ پاک میں بھی زندہ فرمایا گیا ہے بلکہ یہاں تک فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ انہیں مردہ گمان بھی نہ کرو، خود تو زندہ ہیں ہی لیکن موت کا ظاہری لبادہ اوڑھ کر اور نظروں سے دائمی اوجھل ہو کر قوم و ملت کو حیاتِ نو کی نوید سنا جاتے ہیں، شہید کی زندگی قوم کی حیات ہے۔ شہید بحیثیت مجاہد سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے، سرحدوں پر پہرہ دیتا ہے، اقوام خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہوتی ہے اور شہید توپوں کی گھن گرج میں رات کی ساعتیں گزار رہا ہوتا ہے۔ شہادت ایک زیور ہے، جس کے زیب تن کرنے سے جسمانی خدوخال کے علاوہ روحانی نکھار بھی آ جاتا ہے۔ شہید اپنی قوم کے عروج میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

قوم اس وقت اپنے مستقبل کی درخشندگی کے لیے مستعد ہوتی ہے جب وہ ذہنی طور پر آسودہ ہو، فکری اعتبار سے توانا ہو اور اس قسم کے ماحول کی تشکیل کے لیے شہید کا وجود جزو

لا ینفک ہے، جس قوم کی سرحدوں کی حفاظت عظیم لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس قوم کے ہسپتال ویران ہوتے ہیں، اس قوم کے میدان آباد ہوتے ہیں، اس قوم کے کھیت وکھلیان سونا اگلتے ہیں، اس قوم کے افراد معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ تو پھر ہم کیوں نہ کہیں کہ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔

حیاتِ چند روزہ بھی حیاتِ جاوداں نکلی
کسی کے کام آئی جو متاعِ عارضی کب تھی

☆☆☆☆☆☆☆

تعلیم میں کمپیوٹر کا کردار

قوموں کی زندگی میں کچھ لمحات، ان کی تاریخ میں امر ہو کر ہمیشہ کے لیے عزم، ولولے، حوصلے، استقامت اور ترقی وخوشحالی کے سفر پر ان کو آمادہ کرتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ہے کہ انسان کے لیے کائنات کی ہر چیز مسخر کر دی گئی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ کے مطابق کائنات کی ہر چیز انسان کے تابع ہے۔ انسان جب چاہے جہاں چاہے اور جیسے چاہے کائنات کے ذرّے ذرّے پر حکومت کر سکتا ہے۔ قرآن کی اس آیت نے اہل کتب کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا اور کمپیوٹر کو دیکھ کر قرآنِ پاک کی حقیقت تو اور بھی الم نشرح ہو جاتی ہے کہ انسانوں کے لیے کائنات کی ہر چیز مسخر کر دی گئی ہے۔

کمپیوٹر الیکٹرانک کی ایک ایسی ایجاد ہے جو ہمارے لاکھوں مسائل، ہماری بے شمار مشکلات آناً فاناً درست انداز میں حل کر دیتی ہے۔ اس میں معلومات جمع کرنے کے بعد دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہیں یہ اعداد وشمار جمع کرنے اور ان کا تقابلی جائزہ لینے کے کام بھی آتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی (Approach) اور (Data) کا عمل انسانی دماغ سے کئی گنا بہتر اور جلد ہوتا ہے یہ معلومات کو (Print) کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

کمپیوٹر سوئچ، تاروں، موٹرز، ٹرانسسٹرز اور کئی مربوط سرکٹوں پر مشتمل فریمز کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ فریمز مختلف اجزء مثلاً ٹائپ رائٹر، لائن پرنٹر، کارڈ اور مرکزی پراسیسنگ یونٹس پر انحصار کرتے ہیں یہ تمام اجزاء ایک (Network) جسے کمپوزنگ کمپیوٹنگ نظام کہتے ہیں کی خاطر

کام کرتے ہیں۔

کمپیوٹر کا تاریخی پسِ منظر کچھ یوں ہے کہ 1823ء میں ایک برطانوی ریاضی دان چارلس جو ہندسوں کے مرحلے کے فرق کے اُصول پر کام کرتی تھی اس نے اپنی اس مشین کو Difference Engine (ڈفرینس انجن) کا نام دیا۔ اس مشین پر کام کے دوران اس نے تخیل سے ایک پہلی ایسی مشین تیار کی جس سے پروگرام کیا جاسکتا تھا اس نے اس ڈیزائن کی ہوئی مشین کا نام اینا ٹیکل (Analytical) انجن رکھا۔ بابیج اپنے خوابوں کو حقیقت کا جامہ نہ پہنا سکا کیونکہ ان دنوں انجنیئر نگ اور ٹیکنالوجی (Engerering & Technology) کا معیار اتنا بلند نہ تھا تاہم بابیج کی مشین نے کمپیوٹر کے میدان میں تحقیق کی نئی راہیں کھول دیں چارلس بابیج کو جدید کمپیوٹر کا باپ کہا جاتا ہے۔

1980ء میں ایک امریکی ہرمن ہولرتھ (Herman Hollerith) نے پہلا الیکٹرانک کمپیوٹر ایجاد کیا۔ 1946ء میں جان ڈبلیو مارشلے (John.W.Marshly) اور جے پی ایگرٹ (J.P Eckert) نے مل کر الیکٹرانک نیومریکل انیگریٹ اور کلیکولیٹر (Electrical Numerical Integrate and Calculator) تیار کیا جسے اینیک (Eniac) کہا جاتا تھا۔ 1948ء میں اس میدان میں اس وقت ایک اور کامیابی ہوئی جب ہارورڈ۔ ایچ۔ ایکن (Harward .H. Aiken) نے پہلا الیکٹرومکینیکل کمپیوٹر (Electromechincal Computer) تیار کرلیا اور اس کا نام مارک۔ ون (Mark-1) رکھا۔ 1960ء کے اوائل میں سٹیٹ ٹیکنالوجی متعارف ہوئی جس کی وجہ سے انٹیگریٹڈ سرکٹس (Integrated Circuts) یعنی آئی سیز (ICS) وجود میں آئے۔ 1970ء میں ICS نے اتنی ترقی کی کہ کمپیوٹر کے ایک بڑے حصے کو ایک مختصر چپ پر یکجا کر دیا گیا ہے جسے مائیکرو پروسیسر کہا جاتا ہے۔ مائیکرو پروسیسر کی وجہ سے مائیکرو کمپیوٹر کی تیاری وجود میں آئی۔ مائیکرو کمپیوٹر ہی کی وجہ سے کمپیوٹر بڑے اداروں کے ساتھ ساتھ ایک عام آدمی کے استعمال میں آ گیا۔

تعلیم و تدریس میں کمپیوٹر کا استعمال جس انداز سے ہو رہا ہے وہ اظہر من الشّمس ہے، آج کے اس دور میں کمپیوٹر نے تعلیمی میدان میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ پاکستان میں کمپیوٹر کا

استعمال بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ آج کل یونیورسٹیوں نے اپنے علیحدہ کمپیوٹر کے شعبے کھول رکھے ہیں۔ لوگوں کو تربیت دینے کے ساتھ ساتھ یہ تحقیقی کاموں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ آج کل بورڈ کے امتحانات کے نتائج کمپیوٹر کی مدد سے ہی تیار کیے جاتے ہیں۔ کمپیوٹر نہ صرف معلومات کو سکرین پر دکھاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی آوازوں کو بھی اصل حالت میں اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ جیسے جیتی جاگتی تصویریں پیش کی جارہی ہوں۔ کمپیوٹر بنیادی طور پر ان تین حصوں ''سسٹم یونٹ، مانیٹر، کی بورڈ اور ماؤس'' پر مشتمل ہے۔

کمپیوٹر اس جدید دور میں طالب علموں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے، انٹرنیٹ سسٹم کے ذریعے دنیا بھر کی معلومات، تعلیمی و تحقیقی کام پلک جھپکتے ہی کمپیوٹر کی سکرین پر دیکھی جاسکتی ہیں، وہ تمام کام جو اس سے قبل پروجیکٹر، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ وغیرہ سرانجام دیتے تھے وہ من جملہ کام اب صرف ایک کمپیوٹر کی مدد سے کیے جاسکتے ہیں۔ کمپیوٹر کی میموری اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر آسانی سے کتابوں کا ذخیرہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ڈکشنری کی مدد بھی لی جاسکتی ہے۔ اصطلاحات کا صحیح استعمال، الفاظ کے تلفظ اور ادائیگی سکھائی جاتی ہے۔ کمپیوٹر نے انسانی ذہن کو وسعت دی ہے۔ نئی نئی تحقیقات و تخلیقات کو طالب علموں کے سامنے لاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو کمپیوٹر نے ساری دنیا کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔ کمپیوٹر ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی اداروں میں ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا استعمال پاکستان میں بھی تیزی سے عام ہو رہا ہے۔ بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی حالات میں کمپیوٹر کا استعمال تعلیم کے معیاری پہلو کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعے ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو پڑھایا جاسکتا ہے۔

کمپیوٹر کے استعمال سے طالب علموں کی زندگی پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ معلومات کو جلد ہی ذہن نشین کر لیتے ہیں۔

طالب علموں کے نفسیاتی تقاضوں کی ضرورت ہوتی ہے جس وجہ سے تدریس میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

کمپیوٹر کے استعمال سے دنیا بھر کی معلومات چند لمحوں میں حاصل کی جاسکتی ہیں، دوسری تہذیبوں کا مطالعہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعے طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔

کمپیوٹر کی بدولت طالب علموں کی قوت مشاہدہ اور تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔

کمپیوٹر کے استعمال کے جہاں فوائد ہیں وہاں نقصانات بھی ہیں۔اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ کثرت استعمال سے قوت بصارت کمزور ہو جاتی ہے۔زیادہ توجہ مبذول کرنے کی وجہ سے دماغ بوجھل اور تھکن کا شکار ہو جاتا ہے۔استاد محض تماشائی بن کر رہ جاتا ہے،ایک رہنما کے علاوہ اس کا کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔تشنہ طلب معلومات سے متعلق وضاحت بروقت نہیں ہوسکتی ہے۔کمپیوٹر کے غلط استعمال سے طالب علم بری عادت کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی تعلیم پر بھی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا و مافیھا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی جو حکمت سے خالی ہو اور اس کی تخلیق بے مقصد ہو،اس طرح کوئی چیز فی نفسہٖ بری نہیں ہوتی اس کا استعمال اسے برا یا اچھا بناتا ہے۔چھری سبزی بنانے یا پھل کاٹنے کے لیے ہے اگر اس سے کوئی کسی کو زخمی کر دیتا ہے تو وہ اس کے استعمال پر منحصر ہے۔رسی جانور کو باندھنے یا چارپایوں میں استعمال کرنے کے لیے ہے اگر اس سے کوئی کسی کو پھانسی دے کر لٹکا رہا ہے تو وہ اس کا استعمال غلط کر رہا ہے۔

کمپیوٹر کی ایجاد ایک عظیم نفع بخش ایجاد ہے۔اگر کوئی اس نعمت غیر مترقبہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے غلط استعمال کرتا ہے تو وہ اس کا اپنا قصور ہے نا کہ اس عظیم شاہکار کا! اللہ تعالیٰ کی اس دی ہوئی نعمت کا شکر اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ اس کا استعمال درست کریں۔اس پر اسلامی لائبریریوں کو دیکھیں۔اس پر مظاہر فطرت کا مشاہدہ کریں،اس پر نفوسِ قدسیہ کے کارہائے نمایاں کو بنظرِ عمیق دیکھیں۔اس پر دیگر ممالک کی ترقی کے عوامل ملاحظہ کریں ،کمپیوٹر کا مثبت استعمال ہمہ جہت ترقی کا ضامن ہے۔اگر اس کا استعمال مثبت نہ ہو اور اس پر مخرب اخلاق مناظر دیکھے جائیں،تو پھر یہ کفرانِ نعمت ہوگا۔اور کفرانِ نعمت کی مرتکب اقوام بھی ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتیں۔اگر ہمت کریں تو ہم اور بھی اس میں ترقی کر سکتے ہیں۔اس کے ذریعے نئے نئے پروگرام بنائے جاسکتے ہیں،نئے نئے کھیل وضع کیے جاسکتے ہیں۔نئے نئے نقشے تشکیل دیئے جاسکتے ہیں۔اس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ ہمارے اندر کچھ کرنے کا جذبہ ہو۔تسخیرِ کائنات کی روح کارفرما ہو اور ہمارے دل میں خدمت کا جذبہ موجود ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

بجلی کے بحران پر قابو کیسے پایا جاسکتا ہے

نہ چھوڑیں واپڈا والے اگر بجلی تو کیا غم ہے
''یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں''

انسان گھر میں موجود ہے۔ گھر کا سارا نظام اس کی سرپرستی میں بحسن وخوبی رواں دواں ہے۔ دریں اثناء گھر کے آنگن میں خفتہ شیر خوار بچہ آواز کے ساتھ رو رہا ہے اور اس کے رونے کی وجہ کوئی بیماری نہیں، کوئی اور خارجی عمل نہیں صرف اور صرف لوڈ شیڈنگ کے سبب شدت حرارت ہے جس نے معصوم کی نیند حرام کر دی ہے، اس کی اس بے چینی نے والدین کے قویٰ کو مضمحل کر دیا ہے اور پورے گھر میں ایک بحران کی سی کیفیت ہوگئی ہے۔ اور اس قسم کے بحران صرف کسی خاص علاقے میں نہیں ہیں بلکہ ملک کی کثیر آبادی اس سے متاثر ہے۔

برقی رو کی کمی یا قلت سے ہر ایک متاثر ہوتا ہے۔ لائبریری میں کوئی پرسکون فضاء میں محو مطالعہ کتب ہو، یا ظرف ہائے طعام اُٹھائے موجود غلام گردش ہو، کوئی کوچہ بازار میں موجود ہو، یا کوئی گھر کی بالکونی میں قیام پذیر ہو، کوئی صنعتکاری کے میدان سے مربوط ہو، یا کوئی زراعت و کاشتکاری کے میدان سے وابستہ سب کے سب بجلی سے نبرد آزما ہیں۔

اس بحران پر قابو پانے کے لیے اقلیم عقل وخرد کی فرمانروائی کے ساتھ نصرت الٰہی کا طلبگار ہونا ہوگا۔ اس مہیب سائے کو اجالے میں بدلنے کے لیے ابتدائی طور پر کاشانۂ خویش کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اصراف وتبذیر جیسی خصائل قبیحہ سے کنارکشی اختیار کرنی ہوگی، کفایت شعاری جیسی خصلت صالحہ کو

اوڑھنا بچھونا ہوگا۔ اگر ایک شخص فضول خرچی جیسی لعنت سے چھٹکارا حاصل نہ کرے اور دن رات اسی عادت سے وابستہ رہے تو وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا، بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ''جو شخص دن کو دیا روشن رکھتا ہے رات کو اس کے دیے میں تیل نہیں ہوتا'' ہمیں بجلی کے بحران پر قابو پانے کے لیے اپنے گھر کے اندر چلنے والی برقی رو کے آلات ایسے استعمال کرنا ہوں گے جو معیاری بھی ہوں اور برقی رو کے استعمال میں کفایت شعاری کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ اس کے علی الرغم ان کے طریقہ استعمال میں تبدیلی لانا ہوگی، حکومت وقت کی طرف سے تقسیم کنندگان بل بجلی پر رقم ہدایت پر عمل درآمد کو یقینی بنانا ہوگا۔ اگر سرکاری احکامات کو پسِ پشت ڈالتے رہے اور رات کی بجائے دن کو بجلی کا چراغ روشن کرتے رہے تو پھر اپنے ساتھ اہل معاشرہ کے ساتھ اور ملک وقوم کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

چونکہ فرمانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب برابر ہیں اس فرمان کے تحت چھوٹے بڑے، صغیر کبیر طویل قصیر، سب برابر ہیں، یہ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم درس مساوات دے رہا ہے، آج ہم ہیں کہ اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، کوئی محکمہ میں اہلکار ہو یا عام صارف سب ایک ہی ہیں۔ بجلی کے استعمال میں اگر اس فرق کو ختم کر دیا جائے تو بجلی کے بحران پر کافی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے کچھ اہلکار جو حکومت سے بجلی کے بلوں میں مراعات کے خواہشمند ہوتے ہیں اور بجلی کا مفت استعمال اپنا حصّہ تصور کرتے ہیں وہ اپنی اس سوچ اور فکر پر نظر ثانی کریں اور جتنی بجلی استعمال کرتے ہیں اتنا ہی بل ادا کریں تو یہ طریقہ بھی بجلی کے بحران پر قابو پانے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ بجلی اب وقت کی انتہائی ضرورت ہے۔ اس لیے اشرافیہ کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسے منصوبے بنائیں جن پر تھوڑے وقت میں کام ہو اور وہ بارآور ثابت ہوسکیں تا کہ ایسے منصوبوں پر غور وفکر شروع کیا جائے جو کبھی بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔ منصوبہ ''نشستند، گفتند، خوردند، برخواستند'' کے حصار سے جب باہر آئے گا، تو اس پر عملدرآمد کے مواقع بھی میسر آئیں گے۔

بجلی کی قلت سے ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والا فرد نالاں ہے، طالب علم فکری اور شعوری طور پر ناکارہ ہو چکا ہے، غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ اس کے تعلیمی معیار پر اثر انداز ہو رہی ہے، اس کربناک صورتحال سے قوم کے مسیحاء مسیحائی کی صفت سے یکسر عاری ہیں، صنعت کاری ہو، کاشت کاری ہو، دواسازی ہو، کپڑا سازی کے کارخانے ہوں، بڑے بڑے ہوٹل ہوں، یا عام مطبخ، بڑی بڑی ملیں ہوں یا عام گھریلو استعمال میں آنے والی سمال انڈسٹریز یہ تمام شعبہ ہائے حیات برقی توانائی کے مرہون منت ہیں۔

حکومتِ وقت کے ارباب علم ودانش سے یہ امر تقاضا کرتا ہے کہ ملک کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے ڈیم بنائے جائیں، نجی طور پر بجلی پیدا کرنے والے فیکٹری اور مل مالکان سے بجلی خریدی جائے، دیگر ممالک جو اس سلسلے میں دست تعاون دراز کریں اُس کی جانب پیش قدمی کی جائے، ملک کے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا جائے، بجلی کے استعمال کے صحیح اور صائب طریقوں سے عوام النّاس کو روشناس کرایا جائے۔ بجلی چوروں کی گرفت کی جائے اور قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس میں ہماری اپنی اور آنے والی نسلوں کی بقا ہے اور اس اسلوب پر عمل پیرا ہو کر بجلی کے بحران پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

نوجوانوں کا اخلاقی بحران

مثل مشہور ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے، عمر کا یہ حصہ عالم شباب گردانا جاتا ہے اور اسی حصے میں کئی نشیب وفراز آتے ہیں، اتار چڑھاؤ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ زندگی عجب انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ آنکھوں میں نشیلا پن ہوتا ہے، اعضاء بدن مضبوط ہو چکے ہوتے ہیں اور جملہ کار ہائے زیست میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا ہے، اور اسی طرح یہ عالم شباب گزر جاتا ہے۔

قابل صد تحسین وہ نوجوان ہے جو اپنی جوانی کو اسلامی اصولوں کے مطابق گزارنے کا آرزومند ہوتا ہے، اور اس طرح اس کے ایّام حیات گزرتے جاتے ہیں اور ماضی کی نظر ہوتے جاتے ہیں۔ اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے والا شخص معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتا ہے، قوم اس پر ناز کرتی ہے، اہل خانہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس دوسرا قوم کے لیے باعث عار ہوتا ہے۔

نوجوانوں کو اخلاقی گراوٹ کا شکار اس کی ہم نشینی کرتی ہے، برے اور مذموم لوگوں کا ماحول اس کی عادات کو خراب کرتا ہے، برے دوست اس کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔ ہر اخلاقی برائی، اخلاقی عیب، اس کی عادت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ زندگی کی رعنائیاں دم توڑ جاتی ہیں، دلفریبیاں عنقا ہو جاتی ہیں اور یوں وہ برے لوگوں کی صحبت سے برا بن جاتا ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند

صحبت طالع ترا طالع کند

جوانی میں جونوجوان توبہ کرتا ہے تو جہاں اس کی زندگی سنورتی ہے وہاں اس کی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔اس کا اٹھنا بیٹھنا معیاری ہو جاتا ہے اور اس کی گفت وشنید جداگانہ ہوتی ہے۔اور اسلامی اصول اسے دیگر غیر مہذب لوگوں کے ساتھ میل جول سے دور رکھتے ہیں۔اور اس عمر میں توبہ کرنے سے میدان حشر میں رسوائی سے بچ جاتا ہے اور وہ اس بات کا مصداق ہو جاتا ہے۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ِظالم می شود پرہیز گار

نوجوان میں جو اخلاقی بحران پایا جاتا ہے اس کے سبب ''برے دوستوں کی صحبت،نشہ کی عادت،دین سے دوری،میڈیا کا وجود،موبائل کا غلط استعمال،والدین سے لاپرواہی،اساتذہ کی تربیتی غفلت،پرنٹ میڈیا کے اشتہارات،الیکٹرانک میڈیا میں عریانی،یہ تمام اسباب ہیں جن کی بدولت نوجوان اخلاقی بحران کا شکار ہوتے ہیں۔ان کی طرف توجہ دی جائے تو یہ طوفان تھم سکتا ہے۔

جدھر دیکھیں اُدھر عُریاں نظر آتی ہیں تصویریں
نہیں یہ تو نہیں اقبال کے خوابوں کی تعبیریں

☆☆☆☆☆☆☆

بیماری سے مقابلہ

انسان جب بیماری کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو بیماری کی شدت میں کمی شروع ہو جاتی ہے۔ بیماری کے حملوں میں وقفہ بڑھتا جاتا ہے اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کی قوت ارادی اس کو صحت مند بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

اگر وہ بیماری کے خوف کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے اور بزعم خود موت کو قریب تصور کرتا ہے تو اس طرح بیماری میں کمی آنے کی بجائے اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس لیے بیماری کے دوران قوت ارادی کو مضبوط رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
اس دور میں جینا لازم ہے جس دور میں جینا مشکل ہو

بیماری کے خاتمے اور بچاؤ کے لیے عوام اور ریاست کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ظلماتِ امراض کو صحت و تندرستی کے اجالے میں بدلنے کے لیے دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ماحول کو آلودگی سے بچانا، معیاری ادویات کی فراہمی، ملاوٹ سے پاک اشیاء کی مارکیٹ میں موجودگی کا انتظام کرنا، ہسپتالوں میں ہمہ قسم سہولیات کی فراہمی، اخبارات کے ذریعے، ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے شعوری آگاہی، تعلیمی نصاب میں بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مضامین کا اندراج، زرعی پیداوار کے لئے خالص سپرے اور معیاری کھاد کی فراہمی کو یقینی بنانا،

ان ہمہ قسم آسائشوں کی فراہمی اگر ریاست اور حکومت وقت کی ذمہ داری ہے تو عوام النّاس کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ وہ دستِ تعاون دراز رکھیں۔ انہی اسلوب پر عمل پیرا ہو کر ہی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس میں فرد، معاشرہ، قوم اور ملک کی صحت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سیلاب کی تباہ کاریاں

پانی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے۔ انسان کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔ یہ عناصرار بعہ کا ایک اہم جزو ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہر زندہ شے کو پانی سے پیدا فرمایا ہے'' (القرآن) زمین پر اگر کسی شے کی فراوانی ہے تو وہ پانی ہے۔ یہ ہر کس و ناکس کی دسترس میں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لیے حدود متعین کر دی ہیں۔ اگر وہ اپنی حدود میں رہیں اور کوئی حدود شکنی نہ کریں تو وہ اللہ تعالیٰ کا ہمارے لیے عطیہ ہیں۔ اسی طرح پانی اگر اپنی حدود میں رہے تو یہ ایک انعام ہے اور اگر یہ حدود سے تجاوز کر لے اور ندی نالوں، دریاؤں، نہروں اور راجباہوں کے کناروں سے باہر نکل آئے تو طوفان بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی انتہائی نفع بخش چیز بھی نقصان دیتی ہے جیسا کہ پانی بعض دفعہ حلق میں اٹک کر موت کا سبب بن جاتا ہے۔

یہی پانی تھا جو گزشتہ دنوں پاکستانی عوام پر قہر بن کر ٹوٹا، عذاب بن کر نازل ہوا، سیلاب کی صورت اختیار کرتا ہوا کئی نوجوانوں کی جوانی لے گیا۔ کئی عورتوں کو بیوہ کر گیا۔ کئی بچوں کو یتیم کر گیا۔ کئی نئی نویلی دلہنیں شب عروسی سے پہلے اپنے سہاگ لٹا بیٹھیں۔ قمقموں سے روشن گھر قبرستان بن گئے۔ کھیت کھلیان صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ گلستان و نخلستان کا وجود ختم ہو گیا، قصر رفیع کھنڈرات کا نمونہ پیش کرنے لگے۔ کسی نے سر پر سہرا سجانا تھا، کسی نے ہاتھوں پر مہندی لگانی تھی، اس ناگہانی آفت نے ہر ایک کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔ بقول تائب نظامی:

مفلس یہ خبر سن کے ہی بس ڈوب گیا ہے
سیلاب ابھی اس کے مکاں تک نہیں پہنچا

سیلاب کی تباہی نے پاکستان کو کئی سال پیچھے دھکیل دیا۔ لاکھوں عوام بے گھر ہوئے۔ ہزاروں گھر پانی کی نذر ہو گئے۔ مسجدوں اور ممبروں سے آنے والی صدائیں بند ہو گئیں۔ شاہی دسترخوان پر بیٹھ کر ترنوالہ کھانے والے ہاتھ میں کشکول پکڑے بھیک مانگتے ہوئے نظر آئے۔ سیلاب کے خونی تھپیڑوں سے بچ جانے والے افراد، بیماریوں اور فاقوں کی نذر ہو گئے۔ سیلاب زدہ علاقوں میں عفونت پھیل گئی جو باقی ماندگان پر آسمانی بجلی کی صورت میں آئی اور انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا کہتے ہیں کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے لیے یہ قیامت کا منظر ہوتا ہے لیکن اس کا اندازہ اور احساس وہ مرنے والا ہی کر سکتا ہے جب کہ سیلاب کی شکل میں آئی ہوئی اس آفت کو دیکھ کر ہر ذی روح کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ منظر قیامت صغریٰ سے کم نہیں ہے۔

سیلاب نے جہاں مالی جانی نقصان پہنچایا وہاں تعلیمی ادارے بھی متاثر ہوئے۔ متاثرہ علاقوں میں تعلیمی ادارے صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ کئی کئی سالہ ریکارڈ پانی بہا کر لے گیا۔ طلبہ کا مستقبل برباد ہو گیا۔ دینی اداروں میں قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صدائیں بند ہو گئیں۔ گذشتہ پچاس سال میں اتنی سہولت نہ تھی کہ ہر شخص ایسے ہولناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے لیکن اب میڈیا نے یہ سہولت ہم تک پہنچائی کہ ہر کس و ناکس سیلاب زدہ علاقے کو دیکھ سکے اور ان خونی مناظر کا مشاہدہ کر سکے۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اس روحانی رشتے نے اس حالت میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لیے ہر قسم کی مدد کے لیے برانگیختہ کیا بچوں کو بھوک سے بلکتا دیکھ کر، مجروح کو زخموں سے تڑپتا دیکھ کر، مفلوک الحال کو سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر، انسانیت کو پانی میں ڈوبتا دیکھ کر کون خاموش بیٹھ سکتا تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے امداد آنا شروع ہو گئی۔ اسلامی ممالک نے اس آفت ناگہانی سے متاثر ہونے والوں کے لیے بڑھ چڑھ کر امداد کی، دیگر ممالک بھی انسانی ہمدردی کی بنا پر معاونت میں کوشاں رہے، دامے، درمے، سخنے مدد کرتے رہے۔ اس وقت وہ لوگ جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر متاثرہ علاقوں میں امداد لے کر پہنچے قابل صد مبارکباد ہیں یہی

لوگ ایک صحت مند معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ ہمیں بحیثیت مسلمان اپنے اعمال پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے کہ بعض دفعہ ایسی مصیبتیں اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالی سے دعا کرنی چاہیئے کہ ہمیں اس قسم کی آزمائش سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

☆☆☆☆☆☆☆

ماحول کی آلودگی

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، ہر شخص کے رزق کی ذمہ داری اس نے خود لے رکھی ہے، اس نے اس کے بیٹھنے، اُٹھنے، چلنے پھرنے کے کچھ قاعدوں اور کلیوں کا قرآن وحدیث کی شکل میں تعین کر دیا ہے، اور اسلام جو اُس وحدہٗ لاشریک کے نزدیک پسندیدہ دین ہے، گو انسان کے لیے مکمل ضابطہ قرار دیا ہے۔ جہاں دیگر مذاہب میں ماحول کو صاف ستھرا رکھنے پر زور دیا گیا ہے، وہاں اسلام میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے۔ جب آلودہ، آلودگی، آلائش قسم کے الفاظ نظروں کے سامنے متحرک یا ساکت صورت میں ہوتے ہیں تو بغیر کسی ظاہری تعفّن کے بغیر کسی نظر آنے والی عفونت کے دماغ کے جملہ گوشوں کو متعفن کر دیتے ہیں۔ جب یہ غیر مرئی تصورات، خیالات، دماغی آلودگی کا سبب بنتے ہیں، تو مادی شکل میں موجود آلودگی کا وجود کتنا قابل نفرت ہوگا۔

آلودگی کے تصور کو ہم نے محدود کر دیا ہے کوئی چیز اگر اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں موجود نہ ہو تو وہ آلودگی کی آمیزش کا شکار ہے۔ اُس میں آلائش شامل ہے وہ نہ صرف محسوس وجود سے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اس کی زد میں آنے والی گردوپیش کی اشیاء بھی متاثر ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اُس کو شرف، عظمت، بزرگی کے زیور سے آراستہ اور مزیّن فرمایا، اور اس کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ گلستان ہستی میں چلنے والی بادِ نسیم، دریاؤں، سمندروں، بحروں اور بحیروں کی لہروں سے پیدا ہونے والی کھڑ کھڑاہٹ، صحراؤں کی سنسناہٹ، فضاؤں کی سرسراہٹ، سورج کی چمک، ستاروں کی دمک، چاند کی چاندنی، توحید کی مئے سے مست ہونے والے کی راگنی، نرگس وگلاب کی پتیوں پر پڑنے والی شبنم کے قطرے، بادِ صبا کے جھونکوں سے محوِ رقص سرسبز وشاداب درختوں کی ٹہنیاں، عقاب وہما کی درمیان ارض وسما پروازیں، یہ سب ماحول کی شگفتگی اور اس کے دلفریب حسن میں اضافے کا منظر پیش کرتی ہیں۔ لیکن انسان ظلوماً جھولاً کے

مصداق ان مظاہر فطرت میں آلودگی کی ملاوٹ کر کے فضاء کو آئے دن مکدّر کرنے پر کمر بستہ ہے۔

اس معاشرے میں آلودگی مختلف اشکال میں معرضِ وجود میں آتی ہے۔ گھر میں نظام کو درہم برہم کرنے والا شخص خانگی آلودگی کا باعث بنتا ہے۔ معاشرے کے افراد کے سکون کو برباد کرنے والا فرد معاشرتی آلودگی کا سبب بنتا ہے۔ سامان خوردونوش میں ملاوٹ ،ذخیرہ اندوزی، اقربا پروری، دھوکہ دہی ، فریب، جھوٹ، رشوت ستانی، خودغرضی ، نرگسیت ایک خصائل شنیعہ ہیں کہ ان کا حامل شخص پورے ماحول کو آلودہ کرتا ہے اور اس کا وجود بنی نوع انسان کے لیے مردار کی صورت ہوتا ہے جس سے اُٹھنے والی سڑانڈ اور عفونت سے جہاں دنیاوی زندگی متاثر ہوتی ہے وہاں اخروی زندگی کی ابدی اور سرمدی نعمتیں ایک خواب بن کر رہ جاتی ہیں۔ آلودگی فضائی ہو، آلودگی آبی ہو، آلودگی زمینی ہو، آلودگی روحانی ہو یا آلودگی جسمانی ہو الغرض آلودگی کی جملہ اقسام پنپتی ہوئی انسانیت کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فضائی آلودگی فضائی حادثہ کا سبب بن سکتی ہے، آبی آلودگی آبی جانوروں کے خاتمہ کا اور ان کے استعمال سے انسانی زندگی کے خاتمے کا باعث بن سکتی ہے۔ زمینی آلودگی جس کا استعمال سب سے زیادہ ہے، زمین پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر، مردار جانوروں کا سرعام پھینکنا ، اُن پر منڈلانے والی گدھوں کا وجود بے سود، برق رفتار گاڑیوں کے دھوئیں کے مناظر اور سڑکوں پر محوگردش گاڑیوں کے ہارنوں کی پریشان کن آوازیں یہ سب ماحول کو آلودہ کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔

ایک طالب علم جس نے علم کی طلب میں اپنے شب وروز وقف کر رکھے ہیں اور مستقبل میں خدمتِ وطن کا متمنی ہے کیا سبزی فروش کی ریڑھی پر چلنے والے ٹیپ ریکارڈ کی تیز آواز کا شور اس کی آرزو کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا نہ کرے گا؟ کیا مریض جس کو سکون اور خاموشی کی اشد ضرورت ہوتی ہے اس کو بے تحاشا گاڑیوں کی آمدورفت کے دوران بجنے والے غیر ضروری ہارنوں کی آوازیں سکون اور راحت پہنچائیں گی؟ کیا متعفن زدہ علاقے میں پل کر جوان ہونے والا شخص صحت مند معاشرے کے قیام اور استحکام میں مدد و معاون ثابت ہوگا؟ یقیناً ماحول کی آلودگی سے مامون شخص کا جواب ان سوالوں کے بارے میں نفی میں ہوگا۔

اپنے اس ملک کو روحانی، جسمانی، دماغی، اور قلبی طور پر مضبوط دیکھنے کے لیے اور اسے ہر میدان میں ترقی یافتہ دیکھنے کے لیے ہر شخص کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ جس سے اس کی فضاء سازگار ہو جائے گی۔ ماحول کی آلودگی سے تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ ہاں اگر ہم آج یہ طے کر لیں کہ اپنی ساری زندگی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کے مطابق گزاریں گے۔ اپنے تقریباً ساڑھے پانچ فٹ کے قد پر اسلام نافذ کر دیں گے تو یہ بات وثوق

سے کہی جاسکتی ہے کہ ہمارا ماحول نہ صرف قابل فخر ہوگا بلکہ دیگر ممالک بھی ماحول کی آلودگی سے بچاؤ کے لیے ہمارے نقشِ قدم پر چلنا اپنا فرض اولین تصور کریں گے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری حکومت ان مسائل کے حل کی طرف خصوصی توجہ دے، زمینی آلودگی سے نجات کے لیے صفائی کا انتظام کرے، ٹریفک کے بے ہنگم شور سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹریفک کے قوانین پر عملدرآمد کو یقینی بنائے، قانون شکن حضرات کو قرار واقعی سزا دے، فضائی آلودگی کے نقصانات سے تحفظ کی خاطر درختوں کو کاٹنے سے پرہیز کرے، تعلیمی اداروں میں ہفتہ شجر کاری کو یقینی بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے، روحانی آلودگی کی غلاظت سے بچنے کے لیے احکام الٰہی پر پابندی اور بالخصوص اسلام کے ارکانِ خمسہ کی بجا آوری انتہائی ضروری ہے۔

زندگی میں عمل کی اہمیت

زندگی میں عمل کی اہمیت کی وضاحت کچھ اس طرح ہے عمل کے بغیر تصویر زیست ممکن ہی نہیں۔ زندگی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے اور بے عملی یا جمود کا دوسرا نام موت ہے۔ عمل سے زندگی کا بگاڑ ہے، عمل ہی سے زندگی سنورتی ہے، زندگی جنت بھی عمل سے ہی بنتی ہے اور اس عمل ہی کی وجہ سے جہنم بنتی ہے۔ جام زندگی کے دوام کا راز گردشِ پیہم میں پوشیدہ ہے، بے عملی نہ صرف انسان کو سست، کاہل اور کمزور بناتی ہے بلکہ بے یقین اور بزدل بھی بناتی ہے۔ اس کے برعکس عمل انسان کو مستعد، معتمد اور معزز بناتا ہے۔ باعمل اور محنتی لوگوں کو اپنی ذات پر اعتماد اور بھروسا ہوتا ہے۔ جب زندگی میں عمل پیہم کی عادت پڑ جاتی ہے تو اس میں اعتماد اور بھروسہ شامل ہو جاتا ہے۔ اور یہی اعتماد ان سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دلواتا ہے اور ان کو ترقی اور خوشحالی کے زینے پر چڑھا جاتا ہے بے عمل انسان میں ایک قسم کی بزدلی اور مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اس کے جسم و جاں کو مزید زنگ لگا دیتی ہے نتیجتاً سست ہو جاتا ہے اور پھر اس کے لیے زندگی میں مشکلات اور پریشانیوں کا دروازہ وا ہو جاتا ہے اور اس کے حوصلے پست اور روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔

جو انسان صاحب عمل ہوتا ہے وہ اپنے کسی کام کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا وہ اپنا کام خود کرتا ہے اور اس سے وہ مسرت و شادمانی حاصل کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ دوسروں کا شرمندہ احسان نہیں ہوتا۔ بلکہ مسرت عمل بھی حاصل کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم مجسم عمل تھے اور اپنا کام خود اپنے دستِ اقدس سے کیا کرتے تھے۔ اس سے نہ تو کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پریشانی ہوتی تھی اور نہ ہی آپ اپنے ہاتھ سے کام کر کے شرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جوتے ٹوٹ جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے تھے۔ اپنے پھٹے ہوئے کپڑے خود سی لیتے تھے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے تھے غرض دوسروں کو تکلیف دینے کی بجائے اپنا کام خود کرنا پسند فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت اتنی نہیں کی جتنے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے میرے کام انجام دیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بازار سے سودا سلف خود لے آتے تھے، جھاڑو خود دے لیتے تھے، گھر کے دوسرے کاموں میں بھی گھر والوں کا ساتھ دیتے اور ہاتھ بٹاتے۔ سیرت کی کتابوں کا اگر مطالعہ کریں تو بے شمار ایسی معلومات ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عمل کے سلسلہ میں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا تھا۔

ایک سفر میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو کھانا تیار کرنا پڑا سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ایک کام بانٹ لیا۔ جنگل سے ایندھن لانے کا کام حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ذمہ لیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کام بھی ہم آپ کے غلام کریں گے۔ دونوں عالم کے سردار نے فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں خود کو تم سے الگ رکھوں یا اپنے آپ کو بڑا سمجھوں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ساتھیوں سے اپنے آپ کو بڑا شمار کرتا ہو۔ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دیکھا کہ ایک غلام بیماری کی حالت میں اپنے آقا کے ڈر سے آٹا پیس رہا ہے اور روتا جا رہا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کو ہٹا کر خود آٹا پیسنے بیٹھ گئے جب آٹا پیس کر فارغ ہوئے تو فرمایا ''آئندہ بھی ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا'' شیخ فرید الدین عطار کا ہل، بے عمل اور سست آدمی کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں ''جو شخص سستی سے بھرا ہوا اور آرام طلب ہے وہ آدمی نہیں گائے اور گدھے سے بھی گھٹیا ہے۔'' جس شخص نے سستی کو اپنا وتیرہ بنا لیا ذلت کا کلہاڑ اُس کے پاؤں پر آ کر لگے گا۔

یہ چند مثالیں اور واقعات لکھنے پر اکتفا کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ساری زندگی، عزم و عمل سعی و جہد اور استقلال و ثابت قدمی کا نمونہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب دینِ حق کی اشاعت و تبلیغ شروع کی تو ہر طرف سے مخالفت کا

طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور مخالفتوں نے گھر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا ہوا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سعی وعمل سے منہ نہ موڑا اور استقامت کے ساتھ اپنا کام کیا۔ یہاں تک کہ مصائب کے تمام بادل چھٹ گئے اور مخالفتوں کے سب پہاڑ راہ سے ہٹ گئے۔ مقصد کی لگن اور اس کے لیے مسلسل عمل اور سعی پیہم انسان کو دیر سویر کامیابی اور شادمانی سے ہمکنار کر دیتی ہے اور مشکلات سے نجات مل جاتی ہے۔ اسی طرح معلم اگر باعمل ہوگا تو اس کا اثر اپنے تلامذہ پر ضرور پڑے گا۔ اور اگر معلم بے عمل ہوگا تو اس کی تیار کی ہوئی فوج بھی عمل سے عاری ہوگی۔ کوئی عمل بد کر کے یہ نہ سمجھے کے اس کے انجام سے وہ بچ جائے گا جس طرح سمندر میں پتھر پھینکا جائے تو وہ پانی کو ضرور متحرک کرتا ہے اسی طرح انسان کا عمل اپنے اثرات ونتائج ضرور چھوڑتا ہے۔ نوائے وقت کے حوالے سے چند الفاظ ضبط تحریر میں لانے کا مقصد وحید یہی ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ عمل پر بھی توجہ دی جائے تا کہ دینوی اور اخروی زندگی سنور سکے۔ بقول شاعر:۔

خود عمل تیرا ہے صورت گر تری تقدیر کا
شکوہ کرنا ہو تو اپنا کر ، مقدر کا نہ کر

زبان کا غلط استعمال

اللہ تعالیٰ خالق ہے اور بقیہ تمام کائنات مخلوق ہے، کوئی فلکی مخلوق ہے، کوئی ارضی مخلوق ہے، کوئی فضائی مخلوق ہے، مخلوق کا دائرہ کار وسیع ہے لیکن ان جملہ مخلوقات میں اشرف المخلوقات کا تاج اللہ تعالیٰ نے انسان کے سر پر سجایا ہے۔ انسان کو عظمت و رفعت بخشی، انسان کو بلندیوں کی معراج پر پہنچایا۔ اس کا سبب گوشت پوست نہیں تھا، اس کی وجوہات نفاست و لطافت نہیں تھیں۔ یہ اعزاز لحیم اور شحیم ہونے کی بناء پر ودیعت نہیں کیا گیا تھا۔ اس اعزاز کا سبب زبان بنی جو اس کو دیگر مخلوقات سے متاثر کرتی ہے۔

انسان زبان سے تلاوت کرتا ہے، زبان سے نعت پڑھتا ہے، زبان سے راہ و ہدایت کی ترجمانی کرتا ہے۔ زبان سے کلمہ پڑھتا ہے، زبان سے اسلام کی تبلیغ کرتا ہے، زبان سے صداقت و دیانت کا اظہار کرتا ہے، انسان کی یہ صفات اسے حقیقت شناس انسان بنا دیتی ہیں، انسان کو معاشرے کے لیے انعام بنا دیتا ہے، اس کی عظمت کو چار چاند لگا دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان کو فرشتوں سے بھی عظیم بنا دیتی ہے۔ بقول حالؔی:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ ''لوگوں سے اچھے طریقے سے گفتگو کرو'' قرآنِ پاک میں جس طرح نماز کے بارے میں حکم ہے، جس طرح زکوٰۃ کے بارے میں ارشادِ

باری تعالیٰ ہے، جس طرح روزوں کے بارے میں حکمِ ربّانی ہے، بالکل اسی طرح زبان کے استعمال کا بھی ذکر ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر عبادات کی بجا آوری سے جس طرح انسان کی زندگی میں نکھار آتا ہے اسی طرح زبان کے صحیح استعمال سے بھی اس کے جملہ لمحاتِ زیست مرصّع ومزیّن ہوجاتے ہیں، اور وہ اپنی زندگی کو معیاری بنانے میں کامیاب وکامران ہوجاتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جو مجھے جو کچھ دونوں جبڑوں کے درمیان ہے اس کی اور جو دونوں ٹانگوں کے درمیان میں ہے اس کی ضمانت دے دے میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں''، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس فرمان سے یہ بات مترشّح ہورہی ہے کہ زبان کا صحیح استعمال انسان کی اُخروی زندگی میں باعث نجات ہے، یہ بات زبانِ زدِعام ہے کہ یہی زبان انسان کو شاہسوار بنادیتی ہے، اور یہی زبان انسان کو خس وخاشاک سے بھی ادنیٰ بنادیتی ہے، یہ زبان انسان کو انعام وکرام سے بھی نوازتی ہے، اور یہ زبان انسان کے گلے میں جوتوں کا ہار بھی ڈلوادیتی ہے۔ یہ زبان بدزبان کو معاشرے کا ناسور بنادیتی ہے اور خوش گفتار کے سینے پر عظمتوں اور رفعتوں کے تمغے سجادیتی ہے۔

حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں'' اگر ایک انسان اپنی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچارہا ہے تو وہ گوشت پوست کا چلتا ہوا شیطان نما انسان تو نظر آسکتا ہے، لیکن ایک مسلمان تصور نہیں کیا جاسکتا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم کسی کے اخلاق دیکھنا چاہتے ہو تو اس کو غصے کی حالت میں دیکھو'' کہ وہ کس طرح اپنی زبان کا استعمال کررہا ہے۔ انسان گھر میں ہو، بازار میں ہو، مسجد میں ہو، جہاں کہیں بھی ہو اپنی زبان کی بدولت اپنا لوہا منواتا ہے، گالی گلوچ نکالنے والا شخص، واحیات بکنے والا طالب علم، تبّرے بولنے والا ذی روح انسان، سبّ وشتم کرنے والا خوش پوش انسان نام کا تو انسان ہوسکتا ہے لیکن حقیقت میں وہ انسانیت کے حروف ابجد سے بھی ناآشنا ہوتا ہے۔ زبان دراز شخص کبھی معزز نہیں ہوسکتا۔

کہاوت مشہور ہے کہ ہاتھ اور اوزار سے لگایا ہوا زخم مندمل ہوجاتا ہے لیکن زبان سے لگایا ہوا زخم نہ صرف مجروح کو مرغ بسمل کی طرح تڑپاتا ہے بلکہ قبر کے دہانے تک ساتھ جاتا ہے۔ صرف ضرورت کے وقت زبان کھولنا، اہل علم کا، اہلِ دانش کا، سلف صالحین کا اور اہلِ طریقت کا وتیرہ رہا ہے، زبان کے استعمال سے ہی انسان اپنی حماقت اور صلاحیت دیگر افراد پر آشکارا کردیتا ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان زبان نہیں کھولتا اُس کے عیب اور محاسن چھپے

رہتے ہیں۔تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ جن نابغہ رُوزگار ہستیوں نے جسم کے اس اہم ٹکڑے اور جبڑے کا استعمال سوچ سمجھ کر کیا اہلِ دنیا نے ان کی عظمتوں کو سلام پیش کیا۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پرآشوب دور میں زبان کا استعمال سوچ سمجھ کر کیا جائے۔گالی گلوچ اور بدزبانی سے گریز کیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان اقدس کے مطابق ''جو خاموش ہوا وہ نجات پا گیا'' چپ رہا جائے اسی میں ہماری دنیوی واُخروی کامیابی ہے۔

تا مرد سخن نا گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جہالت ترقی کی دشمن ہے

جہالت اور اس کے کئی ہم آواز الفاظ جیسے حماقت، عداوت، لعنت، نفرت ایک سلیم الطبع شخص کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ کئی اعتبار سے وہ ان سے بیگانہ رہتا ہے۔ان میں بالخصوص جہالت ایک ایسا لفظ ہے کہ جو اس سے مانوس ہو جائے، جہالت کے پردے کو چاک نہ کرے، جہالت کے درخت کی آبیاری کرتا رہے جہالت کے نخلِ مضر کو خس وخاشاک سے صاف کرتا رہے، جہالت کے ناسور سے علم وحکمت کے نشتر سے پیپ نہ نکالے، اور اس کی بھینٹ چڑھ جائے تو اس کی جسمانی، روحانی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی ہر قسم کی ترقی رک جاتی ہے اور قعرِ مذلّت میں گر کر سسکیاں لے لے کر اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔

تاریخ کی ورق گردانی کریں تو یہ بات مترشّح ہوتی ہے کہ انسان نے جو بھی ترقی کی وہ جہالت کی چادر کو تار تار کر کے کی ہے۔علم، واقفیت، آگاہی سے ہی رفعتوں اور بلندیوں پر اپنی کمندیں ڈالی ہیں۔اور جس نے جہالت کے بستر استراحت پر آرام کیا، جس نے جہالت کی شراب سے اپنے اعضائے جسمانی کو پرسکون رکھنے کی سعیٔ ناتمام کی اس کو زندگی میں کبھی سکون نہ ملا بلکہ دربدر کے دھکے ملے۔

جہالت کی چکی میں پستا رہا
جہالت کے موذی سے ڈستا رہا

علم سے مربوط اور وابستہ ہونے کی بنا پر انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ جہالت سے دوری اور علم سے قربت ہی کی بدولت تو انسان کو فرشتوں پر بھی برتری اور فضیلت حاصل ہوئی، اسی کی بدولت انسان منصبِ خلافت پر فائز کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل و دماغ کو بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ مسلسل ارتقاء کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ آج تک انسان نے جس قدر ترقی کی ہے وہ جہالت سے نفرت کر کے اور علم و دانش کو گلے لگا کر کی ہے۔ علم سے لگاؤ، علم سے محبت، علم سے دوستی، علم سے قربت تقاضائے انسانیت ہے بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:۔

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

قرآن پاک میں جاہل لوگوں کی مذمت آئی ہے ''جاہل اور عالم برابر نہیں ہو سکتے۔'' (القرآن) اور جب جاہلوں سے بات کرنے یعنی مخاطب ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو تو اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ تم اپنے دماغ کو ان کے ساتھ گفتگو میں کوفت دو اور تھکاؤ ان کو بس سلام کہ کر دور ہو جاؤ۔ جاہل کو کیا یہ سزا تھوڑی ہے کہ وہ عالم اور دانا کے برابر نہیں ہو سکتا اور پڑھا لکھا شخص اس کی جہالت پر استحکام کی وجہ سے اس کے ساتھ بات کرنے کو تیار نہیں، ایسا شخص ترقی تو کیا کرے گا اس کا وجود ہی پڑھا لکھا معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ حدیث پاک میں ہے:۔ ''کہ گود سے لے کر گور تک علم حاصل کرو۔'' ایک اور مقام پر ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے، جہالت سے نفرت اور علم سے دوستی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث پاک سے واضح ہو رہی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک صحابی موجود ہے اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس سے محو گفتگو ہیں کہ دریں اثناء حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر خدمت ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو شخص موجود ہے اُس کی موت کا وقت آ گیا ہے اور فلاں لمحہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی۔ آپ نے اس کی خبر مذکورہ شخص کو دی اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت میں کیا عمل کروں کہ جو دین و دنیا میں اور اُخروی زندگی میں میرے لیے بہتر

ہو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ نماز ادا کر، نوافل پڑھ لو، ہمسایہ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مساجد تعمیر کرو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کلماتِ جہالت سے نکل کر دانش وآگہی کے حصار میں آجاؤ یعنی علم حاصل کرو معلوم یہ ہوا کہ جہالت اگر دنیا میں تنزلی کا باعث ہے تو آخرت میں بھی اُخروی نعمتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ جاہل ہر شعبے میں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسی عظیم ہستی بھی اکثر و بیشتر دعا فرمایا کرتے تھے کہ یارب العالمین میرے علم میں اضافہ فرما۔

اس عالم میں جو بڑے بڑے کام ہوئے وہ کسی جاہل نے نہیں صاحب علم و دانش نے سرانجام دیئے۔ آئے دن نت نئی ایجادیں، اقتصادی شعبے میں ترقی، معاشی شعبے میں ارتقاء، صنعتی شعبے میں پیش رفت، فضائے فلک پر پروازیں، جبالِ شامخہ کی سینہ شگافی، متعدد لیل ونہار پر مشتمل سفر کو چند ساعتوں میں طے کرنا، ہزاروں میل دور بیٹھ کر آواز صرف سننا بلکہ تصویر بھی دیکھنا یہ سب علم و دانش، واقفیت وآگاہی ہی کی بدولت ہے۔

اگر ہم نے اپنے آپ کو معاشی لحاظ سے، دینی لحاظ سے، جسمانی لحاظ سے، روحانی لحاظ سے مستحکم کرنا ہے تو جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکل کر، جہالت کی خاردار وادی سے نکل کر، جہالت کے بحرِ ظلمات میں ڈبکیاں کھانے کی بجائے میدان علم و دانش میں شاہسواری کرنی ہوگی، آسمان علم و دانش پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنا ہوگا۔ گلستانِ آگہی میں چنبیلی اور گلاب کے پھول بننا ہوگا۔ علم کے حصول میں آنیوالی سختی کو خوشدلی سے برداشت کیا جائے۔ جو حصولِ علم میں لمحہ بھر کی سختی و برداشت نہیں کرتا اُس کو عمر بھر جہالت کی سختیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

چلے چلو کہ منزل ہے ابھی نہیں آئی

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

منزل کے حصول کے لیے جدوجہد اور کدوکاوش ہر ذی روح کا وتیرہ رہا ہے۔ منزل انہیں ملتی ہے جو جستجوئے منزل میں اپنے شب وروز گزار دیتے ہیں۔ منزل انہی کا استقبال کرتی ہے جو اس کے حصول کے لیے راستے میں آنے والی رکاوٹ کو ختم کر کے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ منازل کے تعین میں ہی اپنی زندگیاں صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں کر سکتے کہ اپنی منزل مقصود کا انتخاب کر لیں۔ بے معنی اور لایعنی باتوں کی طرف توجہ ان کی عادت ثانیہ بن چکی ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو منزل کا تعین تو کر لیتے ہیں لیکن عاقبت نا اندیشی کی بدولت ان کا تعین ہی صائب اور درست نہیں ہوتا۔

حشرات الارض سے لے کر انسان تک جو اشرف المخلوقات گردانا جاتا ہے ہر ایک اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ مور و مگس کی منزل اور ہے، گل و لالہ کی منزل اور ہے، جوئے نغمہ خواں کی منزل اور ہے۔ حریر و پرنیاں کی منزل اور ہے، زمین پر رینگنے والے کیڑے کی منزل اور ہے، پھول کے گرد بھنبھنانے والی شہد کی مکھی کی منزل اور ہے، غلاظت کے ڈھیر پر چکر لگانے والی مکھی کی منزل اور ہے۔ گلستان سرسبز میں چہچہانے والی بلبل کی منزل اور ہے، برگد کے درخت پر بیٹھے بوم کی منزل اور ہے، آبادی کے مضافات میں شجر بارآور کی منزل اور

ہے، ویرانی میں کھڑے خشک تنے والے درخت کی منزل اور ہے، فضاء میں محو پرواز عقاب وشاہین کی منزل اور ہے مردار کے گرد چکر لگانے والی گدھ کی منزل اور ہے۔

اس کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بے کار پیدا کی گئی ہو، جس مقصد کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے اگر وہ اپنے مقصدِ پیدائش میں کامیاب ہے یعنی اس کی تخلیق کا جو مقصد ہے وہ اس پر پورا اتر رہی ہے تو گویا وہ اپنی منزل کے تعین اور حصول میں کامیاب ہو چکی ہے اور اگر وہ اپنے مقصدِ تخلیق میں ناکام ونامراد ہے تو وہ اپنی منزل کے تعین میں اور حصول میں ناکام ہو چکی ہے۔ اگر ہم بنظرِ عمیق حشرات الارض کی زندگی کا جائزہ لیں تو اکثر و بیشتر وہ قطار بنائے رزق کے حصول کی خاطر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔ غیر ذوی العقول ہونے کے باوجود اس کی روانگی بڑی منظّم ہوتی ہے۔ اور اس وقت ان کی منزل مقصود کسی مقام پر جا کر حصول رزق ہوتا ہے۔ مغرب سے تھوڑا پہلے جب ہماری نظریں آسمان پر موجود محو پرواز پرندوں کے جھنڈوں کا تعاقب کر رہی ہوتی ہیں تو اس طرف سے پلٹ کر آنیوالے تصورات دماغ کے دریچوں کو دستک دیتے ہیں اور یہ فکر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اب ان کی منزل سارا دن دانہ دنکا چگنے کے بعد اپنے آشیانے اور گھونسلے ہیں۔

کامیاب کھلاڑی کی اپنی منزل مخالف کھلاڑی کو شکست دینا ہوتی ہے، کامیاب قانون دان اور وکیل کی اپنی منزل اپنے مخالف قانون دان اور وکیل کے دلائل کو رد کر کے اپنے دلائل کا استحکام ہوتی ہے۔ مجاہد اپنی منزل کا تعین اس طرح کرتا ہے کہ وہ سرحدوں کی حفاظت احسن طریقے سے کرے، صنعتکار کی منزل اپنی صنعت کی ترویج اور ترقی ہے، منبر پر بیٹھ کر وعظ ونصیحت کرنے والے واعظ شیریں بیاں کی منزل اس کی تقریر کی کامیابی ہے، کرسی انصاف پر بیٹھ کر بے لاگ فیصلہ کرنے والے منصف اور جج کی منزل بہترین فیصلہ ہے جو اس نے سنانا ہے، دکھتی اور تڑپتی ہوئی انسانیت کی خدمت کرنے والے مسیحا کی منزل مریض کی شفایابی ہے۔

ہر ایک نے اپنی اپنی منزل کا تعین کر رکھا ہے لیکن نابغۂ روزگار حضرات بھی ایک مقام پر متمکن ہونے کو کامیابی نہیں سمجھتے وہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ایسے لوگ صحت مند معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں، ایسے لوگ میدان علم و دانش کے شاہسوار ہوتے ہیں، ایسے لوگ آسمانِ علم وآگہی کے آفتاب و ماہتاب ہوتے ہیں۔ ایسے ذی فہم و

فراست لوگوں کے قدم منزلیں خود چوما کرتی ہیں۔ایسے لوگ ظاہراً عامیانہ حالت میں ہوتے ہیں لیکن زمانہ ان کے پیچھے ہوتا ہے، اُن کا دنیوی اور دینی معیار جداگانہ ہوتا ہے، جس طرح 10 روپے والا نوٹ بھی کاغذ کا ہوتا ہے اور 100 روپے والا نوٹ بھی کاغذ کا ہوتا ہے۔حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جو منزل کا تعین نہیں کرتے وہ اعلیٰ مقام میں اور منزل کے حصول میں انتھک کوشش کے راستے پر گامزن رہتے ہیں اُن کو نیکیاں عام لوگوں کی نسبت زیادہ حاصل ہوتی ہیں کیونکہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ کی تلاش میں رہتے ہیں۔

منزل سے آگے بڑھ کر منزل تلاش کر
دریا اگر ملے تو سمندر تلاش کر

بقولِ اقبال:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

کشمیر کے ایک گھرانے میں پیدا ہونے والے لڑکے نے اعلیٰ سے اعلیٰ کی تلاش میں وقت گزارا اللہ تعالیٰ نے اسے حکیم الامت بنا دیا، فرید الدین نے اپنے شب وروز روحانی مراتب طے کرنے میں بسر کیے اور اعلیٰ سے اعلیٰ کی تلاش میں اللہ تعالیٰ نے گنج شکر بنا دیا، علی ہجویری کو داتا گنج بخش بنا دیا، جلال الدین کو صوفی باصفا بنا دیا، بہاؤ الدین زکریا کو ولی ءکامل بنا دیا، وہ انسان بڑا خوش نصیب ہوتا ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ اور ارفع سے ارفع کی جستجو میں منہمک رہتا ہے اور کسی ایک مقام پر اکتفا نہیں کرتا اور ہمیشہ اپنے ضمیر سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اے ناداں انسان اپنی منزل کے حصول کے لیے سفر کو جاری رکھ تھک ہار کر نہ بیٹھ جا تو اشرف المخلوقات ہے اور تیری منزل بھی بلند و بالا مقام پر ہے۔اپنے سفر کو جاری رکھ ’’چلے چل کہ منزل ابھی باقی ہے‘‘

چڑیوں کی طرح دانے پہ گرتا ہے کس طرح
پرواز رکھ بلند کہ بن جائے تُو عقاب

☆☆☆☆☆☆☆

جمہوریت بہتر یا آمریت

جمہوریت کی تعریف کرتے ہوئے ایک مرتبہ ابراہیم لنکن نے کہا تھا کہ جمہوریت ''عوام کی حکومت عوام کے لیے عوام کے ذریعے'' ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جمہوری طرز حکومت میں عام آدمی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اشرافیہ، جاگیردار اور سیاستدان کو عام آدمی کی خواہشات کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کی تمام سیاسی سرگرمیوں کا اصل مقصد ان غریب عوام کی فلاح و بہبود ہو جو انہیں اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں اور جن کے سامنے وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں اس طرز حکومت کو کامیابی کے ساتھ اپنایا گیا۔ امریکہ اور ہندوستان کو جمہوریت کی دو روشن مثالوں کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں چونکہ سارا دارومدار عوام پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ عوام کی حکومت ہوتی ہے، اس کی جملہ توانائیاں فلاحِ عوام پر صرف ہوتی ہیں اس کا مدعا اور مقصد وحید عوام الناس کو سکون پہنچانا ہے اور اس کے اطمینان میں دراندازی کرنے والی ہر شے کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرنی ہے، اس کی معاشی، اقتصادی، معاشرتی، صنعتی ترقی کے لیے جہد مسلسل کرنی ہے۔ اس حکومت میں چونکہ ایک فرد کا کردار ادا نہیں ہوتا پوری عوام شامل ہوتی ہے ہر اس کام کی جو اجتماعی طور پر نفع بخش ہوتا ہے اس کی ہر پلیٹ فارم پر حمایت کی جاتی ہے اور ہر وہ کام جو اجتماعی طور پر مضرت رساں ہوتا ہے اور نقصان دہ تصور کیا جاتا ہے اس کی مخالفت کی جاتی ہے اس میں عوام کی ترقی کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں۔

جمہوریت کے برعکس جس سرکاری نظام کا ذکر ہوتا ہے وہ آمریت ہے۔ آمریت میں فرد

واحد کا کردار ہوتا ہے۔ اس کی سوچ اور جمہوری حکمران کی سوچ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اس کی سوچ ایک فرد واحد کی سوچ ہوتی ہے۔ وہ نظام حکومت کو صحیح طور پر چلانے کے لیے کبھی صائب نہیں ہوسکتی کیونکہ اس میں مشاورت عوام سے نہیں ہوتی، شیشے کے گھروں میں، ہر سہولت سے مزیّن بالا خانوں میں، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں میں، اے سی کمروں میں بیٹھ کر ایک فرد واحد جس کے ہاتھ میں جملہ کار پردازانِ حکومت کی باگ ڈور ہے وہ بھوک سے بلکتی ہوئی انسانیت، سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی قوم، غربت کی چکی میں پستی ہوئی عوام، بیماریوں کے بحرِ ظلمات میں ڈبکیاں لگانے والے بے بس افراد کے دکھوں کا مداوا کیسے کرسکتا ہے۔ ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت اور آمریت ایک جیسی ہیں یا جمہوریت آمریت سے بہتر نہیں، معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی اس بات کا معترف ہے کہ جمہوری طرز حکومت آمرانہ طرز حکومت سے بدرجہا بہتر ہے۔

قالینوں پر سونے والو تم کو یہ معلوم ہے کیا
کتنے مفلِس مر جاتے ہیں سردی سے بازاروں میں

جمہوری حکومت بھی اسی صورت میں سودمند ثابت ہوسکتی ہے کہ تمام ادارے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ اسمبلیوں میں عوام کے منتخب نمائندے ہوتے ہیں اور وہاں بھی وہ تن دہی سے قانون سازی کے عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اپنے حلقے کی عوام کے سامنے جواب دینا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ عوام کی خدمت کے لیے مستعد رہتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ نماز بروقت ادا نہ کرسکے تو اس کی قضا کا تصور موجود ہے، لیکن حادثے میں زخموں سے چور شخص کو بروقت ابتدائی طبی امداد نہ دی گئی، ڈوبتے ہوئے شخص کو سہارا نہ دیا گیا، نابینا شخص کو گڑھے میں گرنے سے بچانے کی کوشش نہ کی گئی، آگ میں جلتے ہوئے سامان اور گھر کے لیے فوری فائیر بریگیڈ کا انتظام نہ کیا گیا، چور کو چوری کرتے دیکھ کر عمداً اغماضِ بصر سے کام لیا گیا، اور مال وزر کی چمک دمک دیکھ کر اپنے فیصلے کو بدل لیا تو پھر اس کی کوئی قضا ہے اور نہ ہی کوئی کفارہ ہے۔ جمہوریت کے طرزِ حکومت میں عوام ہی مرکوز ہوتے ہیں۔ ہر حوالے سے عوام ہی کی خدمت اور فلاح مقصود ہوتی ہے پھر ہم کیوں نہ کہیں جمہوریت آمریت سے بہتر ہے۔

جمہوریت بہتر ہے آمریت سے یہ صرف موجودہ دور کے ارباب علم و دانش ہی نہیں کہتے بلکہ ہر دور میں جمہوریت کے حق میں ہی آواز اُٹھتی رہی۔ خطیب نے اپنے خطبے میں کہا کہ

جمہوریت آمریت سے بہتر ہے، قاضی نے کرسی انصاف پر بیٹھ کر کہا کہ جمہوریت آمریت سے بہتر ہے۔ منصور نے سولی پر چڑھ کر کہا کہ جمہوریت آمریت سے بہتر ہے، حضرت حسین علیہ السلام نے کربلا میں سر کٹا کر کہا کہ جمہور بیت آمریت سے بہتر ہے، سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے امیر کے انتخاب کے لیے مشاورت کر کے کہا کہ جمہوریت آمریت سے بہتر ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اہم امور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کر کے فرمایا جمہوریت آمریت سے بہتر ہے۔ لاریب جمہوریت آمریت سے بہتر ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مضبوط معیشت مضبوط پاکستان کی ضمانت ہے

پاکستان ہمارا پیارا وطن ہے، ہماری اُمنگوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے، ہمارے بزرگوں اور سلف صالحین کے سہانے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اس کا استحکام ہمارا ہی مرہونِ منت ہے، اس کی ہر لحاظ سے ہم نے ہی حفاظت کرنی ہے۔ مضبوط پاکستان سے مراد اس کے اشجار و احجار کی مضبوتی نہیں ہے یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس میں موجود بلند و بالا محلات کا خام مال اچھا ہو، یا اس کی شاہراہوں پر لگایا ہوا مال اعلیٰ نوعیت کا ہو۔ مضبوط پاکستان سے مراد یہ ہے کہ اس کی معیشت مضبوط ہو۔

ہماری معیشت اگر مضبوط نہ ہوگی تو ہم پاکستان کے استحکام اور اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی بابت تصور تک نہیں کر سکتے۔ معیشت کو بام عروج تک پہنچانے کے لیے سخت محنت تگ و دو کی ضرورت ہے۔ انتھک محنت اور شبانہ روز کاوش انتہائی ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ترجیحاً شعبہ زراعت کی طرف توجہ کی سخت ضرورت ہے۔ زراعت اور کاشتکاری ہماری معیشت کی مضبوطی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا کسان اگر زراعت کے بارے جدید معلومات کا حامل ہوگا۔ جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے بخوبی واقفیت ہوگی تو وہ اپنی کاشت کو برداشت تک لے جانے میں کسی سہو اور خطا کا شکار نہ ہوگا۔ اس کی معلومات اور واقفیت کے تحت بویا جانے والا بیج اعلیٰ قسم کا ہوگا اور پھر اُگنے والی فصل معمار کے لحاظ سے اور مقدار کے لحاظ سے انفرادی نوعیت کی حامل ہوگی۔ اس کی اس کدو کاوش اور انتھک محنت کا ثمر لینے کے لیے، خاندان کے لیے، قوم کے لیے اور معاشرے کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔ ہمارے ملک کی آبادی کی اکثریت کا دارومدار زراعت پر ہے۔

معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی طرف بھی

توجہ کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری صنعتیں جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہوں گی تو ہماری پروڈکشن میں اضافہ ہوگا، ہماری مصنوعات اعلیٰ قسم کی ہوں گی، اس سے جہاں ہم اپنے ملک میں اپنی مصنوعات کی بدولت عزت وعظمت کی معراج پر ہوں گے وہاں دیگر ممالک میں بھی ہمارے کارخانوں اور فیکٹریوں کی بنی ہوئی اشیاء کو قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ معیشت کے استحکام کے سلسلہ میں صنعتکاری کے شعبے کو بھی پروان چڑھانا جزولاینفک ہے۔ اس سے ہماری برآمدات میں اضافہ ہوگا اور جب برآمدات بڑھ جائیں گی تو لامحالہ معیشت پر بھی ایک خوشگوار اثر پڑے گا۔ معیشت سے مراد صرف یہ نہیں کہ ہمارے گردونواح میں بلند و بالا عمارتیں ہوں، ہمارے باغات سرسبز ہوں، ہمارے میدان و جنگلات طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہوں، ہماری شاہراہیں بڑی بڑی ہوں، بلکہ معیشت سے مراد یہ ہے کہ ہمارا کسان اپنی زراعت اور کھیتی سے مطمئن ہو، ہماری صنعتوں کا مالک اپنی صنعت سے مطمئن ہو، اور تمام افرادِ قوم ہر لحاظ سے فرحت وانبساط کی کیفیت کے حامل ہوں۔ معاشی لحاظ سے جملہ شعبہ ہائے حیات مضبوط ہوں۔ معیشت کو عروج بخشتے ہیں جہاں دیگر عوامل کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں وہاں برقی توانائی کی اہمیت بھی مسلمہ ہے، اگر لوڈشیڈنگ کا عذاب اسی طرح قائم رہا بجلی کی آنکھ مچولی مسلسل جاری رہی تو ہماری معیشت بری طرح برباد ہو جائے گی، ہماری معیشت میں رہی سہی سکت بھی ختم ہو جائے گی۔ ہمارے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائیں گے۔ اس توانائی سے چلنے والے کارخانے بند ہو جائیں گے۔ برآمدات بری طرح متاثر ہوں گی۔ ہمیں اپنی برقی توانائی کی قلت کو ختم کرنے کے لیے بڑے بڑے منصوبوں پر عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ ڈیم بنانا ہوں گے۔ پرائیویٹ سیکٹر کو شامل کرنا پڑے گا۔ دیگر ممالک جو ہمارے ساتھ دستِ تعاون دراز کریں گے۔ ان کی اس پیشکش کو جذبہ خیر سگالی کے تحت قبول کرنا ہوگا۔ مل مالکان اور کارخانہ دار حضرات سے اگر بجلی خریدنی بھی پڑے تو اس کو ضرور خریدنا ہوگا۔ اس لیے کہ بجلی کا وجود معیشت کو دوام بخشنے میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک خرقہ پوش انسان سے لے کر خلعت فاخرہ زیب تن کرنے والے فرد تک ہمہ قسم افراد اس سے وابستہ ہیں۔ اور اس کی جملہ شعبوں میں ضرورت کے معترف ہیں۔

پاکستان کی مضبوطی اور استحکام کا راز معیشت کی مضبوطی میں ہے۔ ہماری بیرونی تجارت بھی ہماری معیشت کو مضبوط بنانے میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتی ہے۔ بیرونی تجارت معیاری ہوگی برآمدات میں اضافہ ہوگا اور درآمدات میں کمی ہوگی تو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں

کھڑے ہوں گے۔ آج اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری معیشت مضبوط ہو، ہمارے ملک کے باشندگان کا ایک معیار ہو، ہماری جامعات معیاری تدریس فراہم کریں، ہمارے کارخانے اور فیکٹریاں اپنی مصنوعات میں اضافہ کریں تو ہمیں خلوص نیت کے ساتھ ساتھ ادھر توجہ مبذول کرنا ہوگی۔ زراعت، صنعت وحرفت، برقی توانائی اور بیرونی تجارت کے ساتھ ساتھ عدل وانصاف کا دامن بھی تھامنا ہوگا۔ کیونکہ جہاں عدل ہوگا وہاں ظلم نہیں ہوگا اور جہاں مظلوم کی دادرسی ہوگی وہاں امن اور استحکام ہوگا، اور جس علاقے میں امن واستحکام ہوگا وہاں کی معیشت بھی مضبوط ہوگی اور ملک بھی مضبوط ہوگا۔

ڈینگی مکاؤ مہم میں معاشرے کا کردار

ڈینگی بخار ہے جو چند ماہ سے پاکستان کے عوام کے لیے خوف کی علامت بنا ہوا ہے۔ یہ بخار 1775 میں افریقہ، شمالی امریکہ اور ایشیاء میں پراسرار طور پر نمودار ہوا، اس بخار کا سبب مادہ مچھر ہوتی ہے جو کاٹتی ہے تو بخار ہو جاتا ہے۔ اس بخار کے پیراسائیٹس کو پلازموڈیم کہتے ہیں۔ یہ مادہ مچھر ایک اعلیٰ ترین نسل سے منسوب کی جاتی ہے جو گندے پانی وغیرہ کو پسند نہیں کرتی بلکہ خوشنما سرسبز پھولوں، پھلوں والے پودوں اور درختوں پر ڈیرہ جماتی ہے۔

ڈینگی بخار ایک مرض ہے، جس طرح دیگر امراض سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے اسی طرح یہ مرض بھی اپنے خونخوار پنجوں میں جکڑنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ لیکن کوئی مرض ایسا نہیں ہے کہ جس کا علاج موجود نہ ہو۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو، یعنی تمام مرض علاج سے ختم ہو جاتے ہیں۔ جب ایک ذی شعور انسان اس قسم کے حوالہ جات اپنے دماغ کے آنگن میں رکھتا ہے تو وہ ان عوارضات سے کبھی متاثر نہیں ہوتا وہ علاج کرتا ہے اور مسلمان ہونے کے ناطے بالخصوص اور انسان ہونے کے ناطے بالعموم شفاء من جانب اللہ کا تصور چاہتا ہے۔ اپنے اس اعتقاد کی بدولت کہ موت کا ایک دن مقرر ہے وہ اس بخار کے خوف کو اپنے نہاں خانۂ دل میں کوئی جگہ نہیں دیتا۔ اس بخار کے خاتمے میں اس قسم کے اعتقادات اور تصورات بڑی اہمیت کے حامل گردانے جاتے ہیں۔ اور یوں نفسیاتی طور پر اس سے متاثر مریض

صحت یاب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ڈینگی بخار کے خاتمے کے لیے معاشرتی طور پر ایک اہم رول ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ واعظ ممبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر براجمان ہو کر عوام الناس کو اپنے خطبے کے دوران مرض کے بارے میں بتائے اور انہیں اس کے نفسیاتی اثرات سے چھٹکارا دلائے اور باور کرائے کہ یہ ایک مرض ہے جس طرح دیگر مریض علاج سے صحیح ہو جاتے ہیں یہ مرض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تمام پلیٹ فارموں پر اس کے بارے میں شعور و آگہی دی جائے۔ اور اس کے اسباب رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

گھر سے لے کر محلوں، دیہاتوں اور شہروں میں عوام الناس کو مطلع کیا جائے کہ اس مرض کے خاتمے میں وہ حکومت کا ساتھ دیں۔ حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔ ان کی معاونت سے ہی اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہسپتالوں میں، تعلیمی اداروں میں، کھیل کے میدانوں اور کھلیانوں میں، عدالتوں اور گلیوں بازاروں میں جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ وہاں صفائی کا خاص خیال رکھا جائے، متاثرہ مریض دیگر افراد کو محفوظ اور مامون رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ مساجد، تعلیمی ادارے، معروف چوک، اور دیگر مقامات پر ڈینگی سے بچاؤ کے اشتہارات اور بینرز لگائے جائیں۔ متاثرہ مریض کو فوری طور پر ہسپتال پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے، مریض کے لیے ادویات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے، غریب اور نادار مریضوں کے ساتھ خصوصی تعاون کیا جائے۔ مریض سے نہیں بلکہ مرض سے نفرت کی جائے۔

معاشرہ افراد پر مشتمل ماحول ہی کو کہا جاتا ہے۔ اور یہی افراد جب مل کر کسی کا مقابلہ کرنا چاہیں تو اتحاد و اتفاق کی بدولت ان کی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے جملہ قویٰ و اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اس وقت جس طرح سرکاری سطح پر اس مرض کے خاتمے کے لیے انتھک کوشش بروئے کار لائی جا رہی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس ڈینگی مکاؤ مہم میں حکومت کے شانہ بشانہ معاشرتی طور پر شمولیت ہو جائے اور افراد اس کے خاتمے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں تو اس کا وجود کلیتاً ختم ہو سکتا ہے۔ اس کی حقیقت کو عملی جامہ پہنانے کی اب اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ڈینگی بخار قابل علاج ہے

انسان جب سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے نشیب و فراز اور افراط و تفریط اس کا مقدر رہے ہیں۔ کہیں مسرتوں اور خوشیوں نے اس کا ساتھ دیا ہے تو کہیں غم واندوہ کی بھیانک وادیاں اس کا مسکن رہی ہیں، کبھی اس کے دل و دماغ خوش و خرم ہوتے ہیں اور کبھی افسردگی اور پژمردگی کی تپش اس کے سہانے خوابوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے، ان متنوع حالات سے انسان کو پالا پڑتا رہتا ہے۔ اور پھر حالات بدلتے رہتے ہیں اور مشکلات آسانیوں کا لباس زیب تن کر لیتی ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

درد و الم کا ستایا ہوا انسان آج کل پھر ایک بیماری جس کو ڈینگی بخار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کی لپیٹ میں ہے۔ یہ بخار 1775 میں افریقہ، شمالی امریکہ اور ایشیاء میں پراسرار طور پر نمودار ہوا، اس بخار کا سبب مادہ مچھر ہوتی ہے جو کاٹتی ہے تو بخار ہو جاتا ہے۔ اس بخار کے پیراسائیٹس کو پلازموڈیم کہتے ہیں۔ یہ مادہ مچھر طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت عروج و شباب پر ہوتی ہے اور پھر اس کے حملے شدید ہو جاتے ہیں۔ یہ مادہ مچھر ایک اعلیٰ ترین نسل سے منسوب کی جاتی ہے جو گندے پانی وغیرہ کو پسند نہیں کرتی بلکہ خوشنما، سرسبز پھولوں، پھلوں والے پودوں اور درختوں پر ڈیرہ جماتی ہے، اس کی حکومت زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہوتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ (اللہ تعالیٰ) مجھے شفاء دیتا ہے'' (پارہ-19 سورۃ الشعراء) اسی طرح حدیث پاک میں ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو۔ قرآن و حدیث کی

تصریحات سے یہ بات متبیّن ہورہی ہے کہ موت جو کہ ایک اٹل حقیقت ہے کے سوا ہر مرض کا علاج خالقِ کائنات اور باعث تخلیق کائنات نے ارشاد فرمایا ہے۔

ڈینگی کا بخار قابل علاج ہے۔لیکن وہم کا مریض لا علاج ہے۔انسان جب یہ بات اپنے دل ودماغ میں بٹھالیتا ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے اور ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکتا تو پھر اس قسم کی بیماریاں اس کے اعتقاد و یقین کو بھی متزلزل نہیں کرسکتیں۔لیکن ڈینگی کے لفظ سے خوفزدہ مریض کا ٹمپریچر بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔اس کا سبب صرف اور صرف توہم پرستی اور دین سے دوری ہے۔

اس سائنسی دور میں جہاں دیگر شعبہ ہائے زیست میں ترقی ہوئی ہے وہاں شعبہ ہائے صحت وامراض میں بھی جدید ٹیکنالوجی نے ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔آج سے صدیوں پہلے جو امراض نا قابل علاج سمجھے جاتے تھے آج وہ نہ صرف قابل علاج ہیں بلکہ ان امراض سے متاثرین مریض کے حواس بھی صحیح اور صائب تصورات کے حامل ہیں۔اُن کی شعوری قوت اپنے ادراک کی بدولت ان پر کما حقہ قابو پانے کا ملکہ رکھتی ہے۔آج جملہ امراض ٹی۔بی (جس کا مریض چند سال قبل مرض کی شناخت سے ہی اہل وعیال،خویش واقارب اور دوست احباب سے بیگانہ کردیا جاتا تھا) ایڈز،کینسر،شوگر،برقان اسود جیسے موذی امراض کا مکمل علاج موجود ہے۔تاہم چند احتیاطوں کی ضرورت ہے۔دانشمندوں کا قول ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔

ڈینگی کے مرض کا علاج ممکن ہے،ڈینگی بخار کے مریض کی صحت یابی کا امکان ہے، ڈینگی مرض سے متاثرہ افراد میں زندگی کی رمق پیدا کی جاسکتی ہے۔اس مرض کے مریض کو صاحب فراش مریضوں کی صفوں سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ڈینگی بخار کے مریض کی پیشانی پر آب زلال سے تر پٹی رکھی جاسکتی ہے۔اور اس کی حرارت کو نہ صرف کم بلکہ بالکل ختم کیا جاسکتا ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ وہ خود دستِ تعاون دراز کرے۔وہ نہ صرف ڈینگی بخار کے لیے تگ ودو کرے بلکہ اپنے اندر حسد،جھوٹ،غیبت،نفرت کے ڈینگی کے خلاف بھی صف آرا ہوجائے۔ اس کے اس اقدام سے اس کے اعصاب میں قوت لایموت آجائے گی اور وہ ڈینگی جیسے جملہ امراض کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردے گا۔ظاہری ڈینگی کے ساتھ ساتھ اس کو باطنی ڈینگی سے بھی نجات مل جائے گی۔کہتے ہیں تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے علاج ہوا اور پرہیز نہ ہو تو علاج کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔انسان غیر صحتمندانہ اقدام کا بار ہا مرتکب ہوتا رہا ہے تو پھر شفاء ناممکن ہوجاتی ہے کیونکہ ''خود کردہ را علاجے نیست'' والی بات ہوتی ہے۔

ڈینگی بالکل قابل علاج ہے۔اس کے لیے باطنی صفائی،توہم پرستی سے کنارہ کشی،دینِ اسلام سے بھی وابستگی،وقت پر تشخیص اور علاج کی ابتداء گھر،محلے میں اس مرض سے بچاؤ کے بارے

میں شعوری کوششیں، اور مرض کا پابندی سے بروقت علاج ضروری ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تصورات کی دنیا میں رہتے ہوئے موت کا علاج بھی تجویز کر دیا ہے یہ تو پھر بھی ڈینگی ہے۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اس شعر کا اگر امعانِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہر ظاہری و باطنی بیماری کا علاج موجود ہے چہ جائیکہ ڈینگی بخار ہے۔ ڈینگی کا علاج موجود ہے۔ ڈینگی کا مرض قابل علاج ہے، اس سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے استقامت کی ضرورت ہے اور وہ دین سے قربت کی بدولت حاصل کی جا سکتی ہے۔

سائنسی ایجادات

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، عظمت کا تاج اُس کے سر سجایا اور جملہ مخلوقات میں اُسے اعلیٰ وارفع مقام پر فائز فرمایا۔ اس کی عظمت کا سبب علم کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی قرار دیا اور غیر ذوی العقول مخلوقات میں سے اسے ذوی العقول مخلوقات کی اہمیت کا لوہا نوری اور غیر مرئی مخلوق ملائکہ سے بھی منوایا یہاں تک کہ تمام ملائکہ اس حیوانِ ناطق کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ یہ ساری عظمتیں، یہ ساری رفعتیں، یہ ساری شفقتیں، یہ ساری عنایتیں، یہ ساری سعادتیں اور یہ ساری فضیلتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائیں۔ کیونکہ یہ بات علم الٰہی میں موجود تھی کہ میری کائنات کے گلشن میں بہار انسان لائے گا۔ میری زمین پر موجود فلک بوس پہاڑوں سے جوئے شیر انسان نکالے گا۔ خونخوار درندوں کو مطیع کرنے والا میرا انسان ہوگا۔

سائنسی ایجادات کا وجود انسان ہی کا مرہونِ منت ہے۔ سائنس کا لفظ جب قوت سماعت پر دستک دیتا ہے، سائنس کا لفظ جب قوتِ بصارت کو متحرک کرتا ہے، سائنس کا لفظ جب قوتِ ادراک و وجدان پر اپنا عکس چھوڑتا ہے، سائنس کے لفظ کی باد بہاری جب قوت شناخت سے اٹھکیلیاں کرتی ہے، قرطاسِ ابیض پر موجود سائنس کا لفظ جب قوتِ لامسہ سے

مس ہوکر پورے بدن میں اپنی تاثیر پیدا کرتا ہے تو فوراً دماغ میں یہ بات پیغام رسانی کا کام کرتی ہے کہ سائنس ایک صفت ہے جو بغیر موصوف کے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی اور جو موصوف اس صفت سے متصف ہوتا ہے کائنات کی رفعتیں اس کے سامنے دست بستہ حاضر ہوتی ہیں، اور اس کے در کی دریوزہ گری کرتی ہیں۔

سائنس علم کی ایک شاخ ہے۔ آج چار دانگ عالم میں سائنس کی بہاریں ہی بہاریں نظر آتی ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ قبل دنیا سے رحلت کرنے والا شخص اگر دوبارہ اس دنیا میں آجائے تو اس کی عقل موجودہ حالات کو دیکھ کر شاید یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ اس زمین پر نظر آنے والی مخلوق کوئی فرشی مخلوق ہے یا کسی اور مخلوق کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ آج کی سائنس نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ ندی نالوں اور برساتی نالوں پر بیٹھ کر ہاتھ دھونے والا شخص آج نل کے قریب جاتا ہے تو بغیر ہاتھ لگائے پانی چلتا ہوا دیکھتا ہے، اور پھر دور ہٹتا ہے تو نل خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ اپنے گھر کے غلام گردش میں بیٹھ کر انسان امریکہ اور یورپ جیسے دور دراز علاقوں کے لوگوں سے محوِ گفتگو ہوتا ہے۔ زادِ راہ کے طور پر نانِ جویں اور ستو اٹھانے والا شخص ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹوں میں طے کرتا ہے۔

سائنس نے ہر میدان میں اپنے وجود کو تسلیم کروایا ہے۔ سائنسی ایجادات کی بدولت انسان کو بڑی بڑی سہولتیں میسر آگئی ہیں۔ انسان کی بڑی بڑی پیچیدگیاں ختم ہوگئی ہیں۔ سائنسی ایجادات کے موجد قابل صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے عقل و شعور کی دولت کو بروئے کار لا کر عوام الناس کی خدمت کی ہے۔

گراموفون، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر، بحری جہاز، ہوائی جہاز، ایکسرے مشین، خلائی جہاز، راکٹ، کمپیوٹر، موبائل اور ریموٹ کنٹرولر سسٹم یہ تمام سائنسی ایجادات ایسی ہیں جیسے گلستانِ ہستی میں گلہائے رنگا رنگ بادِ نسیم کے مسحور کن جھونکوں سے جھوم رہے ہوں، کائنات کی تمام بوقلمونیاں، رنگینیاں سائنس کی مرہون منت ہیں۔

سائنس کی ایجادات نے دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ سائنسی ایجادات کو مزید پروان چڑھانے میں ہمیں اس کی طرف توجہ کرنا ہوگی۔ ہماری حکومت کو اس شعبے کی طرف مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دیگر ممالک کی نسبت ہمارے ملک کی جامعات بہت کم سائنس دان پیدا کر رہی

ہیں۔اس شعبے میں کام کرنے والے فطین اور زیرک لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔تا کہ آنے والی نسل کا رجحان بھی اس طرف ہو۔ وہ قوم کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے، اپنے آباؤ اجداد اور سلف صالحین کے کارناموں پر شادمان ہوتی ہے، پدرم سلطان بود کے نعرے لگاتی رہے، اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اس شعبہ کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔نونہالانِ چمن کو ترجیحی بنیادوں پر زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے سائنسی ایجادات کے مواقع فراہم کیے جائیں۔اسی میں ملک کی خوشحالی اور بقا کا راز مضمر ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

پن بجلی کی اہمیّت

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز ایسی پیدا نہیں فرمائی جو غیر اہم ہو اور بے مقصد ہو وُہ کسی نہ کسی لحاظ سے اہم بھی ہوتی ہے اور با مقصد بھی! بعض دفعہ انتہائی معمولی نوعیت کی چیز بے کار سمجھ کر گھر کے کونے کھدرے میں پھینک دی جاتی ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بھی اہم ہو جاتی ہے اور اس کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔اہل دانش کہتے ہیں کہ ”داشتہ آید بکار گرچہ بود سرِ مار“ رکھی ہوئی چیز کام آجاتی ہے گرچہ سانپ کا سر ہی کیوں نہ ہو۔لیکن دنیا میں کوئی چیز بھی غیر اہم نہیں ہے۔

ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

جہاں تک اس پن بجلی کا تعلق ہے یہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے انتہائی اہم ہے کوئلہ گیس وغیرہ سے پیدا کی جانے والی آلودگی کا سبب بنتی ہے وہ ملک جس کے عوام صحت کی بنیادی سہولتوں سے تقریباً محروم ہوں، مارکیٹ میں ڈرگ مافیا نے دو نمبر ادویات کی سپلائی عام کر رکھی ہو، صحیح ادویات کا وجود عنقا ہو، کھیل کے میدان کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں سے بھرے پڑے ہوں، ٹریفک کے اژدہانے انسان کی صحت پر مضر اثرات ڈالنے کے لیے اپنے جبڑے پھیلا رکھے ہوں، فیکٹریوں کے مسموم دھوئیں آلودگی پھیلانے میں اپنا اہم رول ادا کر رہے ہوں، وہاں آلودگی پروف پن بجلی کی اہمیت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

پن بجلی جہاں آلودگی کا سبب نہیں بنتی وہاں اس پر اتنا خرچ بھی نہیں آتا اور دیگر الیکٹرک

پاور کی نسبت سستی بھی پڑتی ہے۔صدیوں پہلے لوگ بجلی کے حروف ابجد سے بھی واقف نہیں تھے۔اس کا تصور تک نہ تھا۔روشنی کے لیے مٹی کے دیے یا سرسوں کے تیل کے دیئے بطور چراغ استعمال ہوتے تھے اگر کوئی زیادہ صاحب حیثیت ہوتا تو وہ مٹی یا سرسوں کے تیل کی جگہ گھی کے چراغ جلاتا اور اس سے اپنا گردونواح روشن کرتا۔لیکن جونہی بجلی کی دریافت ہوئی، اندھیرے چھٹ گئے۔ظلمات شب کا وجو ختم ہو گیا، روشنیوں کی زندگی شروع ہوئی وہ دیہات جہاں مغرب کے بعد جانے کو دل نہ چاہتا تھا بقعۂ نُور بن گئے اور دن رات کا تصور ختم ہو گیا، فیکٹریوں اور صنعتوں کی کارگزاری میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ پانی کی بروقت ترسیل سے کھیتوں کی ہریالی میں اضافہ ہوا اور کشتِ زعفران کا نمونہ پیش کرنے لگے۔ جو کام بجلی سے ہوئے جن فیکٹریوں اور صنعتوں کو بجلی کے ذریعے چلایا گیا اور ان کی یومیہ آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔آج ہم بالکل وہی نتائج پن بجلی کے استعمال سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ پن بجلی کی تنصیب پر اتنا خرچ نہیں آتا، منگلا، تربیلا ڈیم، اور غازی بروتھا پر پن بجلی پیدا کی جارہی ہے۔

پن بجلی پانی سے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اور پانی ہی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے جو اس دور میں وافر مقدار میں موجود ہے ویسے بھی تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ایک حصہ مٹی ہے اور تین حصے پانی ہے۔تو چونکہ اس مہنگائی کے دور میں جس میں عوام کی مہنگائی کے سیلاب میں ہچکولے کھاتی ہوئی ناؤ کو کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ہو، ایسا دور جس میں دو وقت کا کھانا انسان کی پہنچ سے باہر ہو، اور مریض جس کے ورثاء حسرت بھری نگاہوں سے ہسپتال کا راستہ دیکھنے میں مصروف ہوں اور وہاں تک رسائی ان کی دسترس سے باہر ہو۔غرباء کے بچے کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مختلف بیماریوں کا شکار ہو رہے ہوں، چینی جیسی عام بنیادی چیز جو ہر گھر کی ضرورت ہے عوام کی قوت خرید اس کی متحمل نہ ہو سکتی ہو، سیلاب زلزلے اور آسمانی آفتیں جن کی معاشی اور اقتصادی حالت کو پراگندہ کر چکے ہوں۔اس صورت میں پن بجلی کا وجود نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

حکومت وقت کو چاہیے کہ ملک کو دیگر ممالک کے ہم پلہ کرنے کے لیے عوام کے طرزِ حیات کو بہتر بنانے کے لیے وہ اسباب جو سستے اور ارزاں بھی ہوں اور افادیت بھی رکھتے ہوں وہ پیدا کیے جائیں بہ حیثیت حکمران ارباب حل وعقد کا فرض بھی ہے اور عوام الناس کی خدمت بھی ہے۔

پن بجلی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نعمت ارزانی ہوئی تو اس سے فائدہ اٹھانا انتہائی ناگزیر ہے،نعمت کی قدر رزق میں اضافے کا سبب بنتی ہے، بے قدری اور ناشکری زوال نعمت کا سبب ہوتے ہیں۔اس کے لیے مزید مقامات تلاش کیے جائیں، پن بجلی پیدا کی جائے اس سستی اور آلودگی سے مبرا بجلی سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے یہ ہر وہ کام کرتی ہے جو دوسری بجلی کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بیماری سے بچاؤ کے لیے ریاست اور عوام کا کردار

بیماری، عارضہ، مرض اور روگ یہ ہم معنی الفاظ ہیں۔مرض اور بیماری صحت اور تندرستی کا متضاد ہے، انسانی اعضاء جب تک اپنے افعال کماحقہٗ سرانجام دیتے رہتے ہیں صحت وتندرستی برقرار رہتی ہے۔اگر ان کے افعال کی بجا آوری میں رخنہ پیدا ہو جائے تو یہ مرض اور بیماری ہے۔اس کا سبب خواہ خارجی عوامل ہوں یا اندرونی طور پر کوئی غیر مرئی طاقت برسر پیکار ہو! تندرستی اور صحت قدرت کی طرف سے ایک عظیم عطیہ ہے۔اس نعمت خداوندی کے زیور سے مرصّع انسان دیگر انعامات الٰہیہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔لیکن اگر کسی کے آنگن میں گلشنِ صحت کے گلہائے رنگارنگ نہیں کھلے۔ بیماری اور مرض کے مہیب ومنحوس سایوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔بستر مرگ پر پڑا ہوا وہ نحیف شخص اپنی نقاہت بھری نظروں سے گلستان صحت وتندرستی میں محو پرواز طائران خوش الحان کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ تو رہا ہے لیکن وہ کائنات کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے بھی حظّ نہیں اُٹھا سکتا۔

تنگدستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

بیماری سے بچاؤ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ عوام لازوال کردار ادا کرے، ہر شخص اپنے گھر کو صاف اور ستھرا رکھے۔اپنے گلی محلے میں عوام الناس میں یہ شعور بیدار کرے کہ بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کیا جائے۔گھر کے آنگن کو صاف ستھرا رکھا جائے۔مچھروں کی آماجگاہ نہ بنایا جائے، ''الطھور شطر الایمان'' کے مصداق

طہارت و پاکیزگی کو اپنا شعار بنایا جائے، روزانہ غسل کیا جائے، ہاتھوں کو کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں دھویا جائے، ناخن باقاعدگی سے تراشے جائیں، ٹوتھ برش یا مسواک کا استعمال بلا ناغہ کیا جائے، ملاوٹ شدہ اشیاء کے استعمال سے احتیاط برتی جائے، ہمہ وقت معدے کو متحرک رکھنے کی بجائے مناسب وقفہ سے غذا استعمال کی جائے، قضائے حاجت کے لیے ایک وقت مقرر کیا جائے۔ ثقیل اور دیر ہضم غذاؤں کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ لطیف اور زود ہضم اغذیہ استعمال میں لائی جائیں۔ موسم کی مناسبت سے لباس زیب تن کیا جائے۔ موسمی پھل حسبِ ضرورت استعمال کیے جائیں۔ پانی صاف اور اُبال کر استعمال کیا جائے۔ جسم کو راحت اور سکون پہنچانے کے لیے نیند کو پورا وقت دیا جائے نیز روحانی سکون کے لیے خاموشی کی عادت اپنائی جائے۔ جسمانی اضمحلال کے ساتھ ساتھ دینی احکام کی بجا آوری سے روحانی ضعف اور کمزوری کو بھی ختم کیا جائے۔ روحانی طور پر مضبوط انسان جسمانی طور پر بھی قوی اور مضبوط ہوتا ہے۔ اور اس سے پیدا شدہ قوت مدافعت انسان کو بیماریوں کے حملے سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔

عوام النّاس کے علی الرغم ریاست اور حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی متعارف کرائے۔ نت نئی سائنسی تحقیق سے آگاہی بہم پہنچائے۔ سستی اور معیاری ادویات کی فراہمی یقینی بنائے۔ شفا خانوں اور ہسپتالوں میں باصلاحیت اور کوالیفائڈ عملہ کا تقرر کرے۔ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے افراد کے علاج کا مفت انتظام کرے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے امراض کے خلاف تشہیر کا انتظام کرے اور امراض سے بچاؤ کے طریقوں سے عوام کو روشناس کرے۔ خطباء اور واعظین اپنے خطبات اور واعظوں کے ذریعے ایک عام آدمی کے ذہن میں یہ بات راسخ کریں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اس لیے کسی بیماری سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں جو رات قبر میں آنی ہے وہ ہر صورت میں آنی ہے۔ اس قسم کے تصور سے انسان اعصابی طور پر مضبوط ہو جاتا ہے اور بیماری کے منحوس پرندے اس کے مکان کی منڈیر سے پرواز کرنا شروع کر دیتے ہیں اور صحت و تندرستی کے اُجالوں سے اس کے گھر کے کونوں کھدروں کو روشنی اور ضیاء پہنچنا شروع ہو جاتی ہے۔

بیماری سے بچاؤ کے لیے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا جائے کہ بیماری کی طرف دعوت دینے والے عوامل کی حوصلہ شکنی کی جائے، غذاء کے استعمال میں توازن برتا جائے، سیر و تفریح کے لیے وقت نکالا جائے۔ قلوب و ذہن کی صحت جسم و جاں کی صحت سے مشروط ہے۔ جسم تندرست ہوگا تو عقل و خرد کے گلشن میں بہار آئے گی۔ اور اگر جسم بیمار ہوگا تو ذہن بھی بیمار ہو

گا۔ کیونکہ صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ اگر عقلِ سلیم ہوگی تو پھر ہوا باز کی پرواز بھی بلند ہوگی، خطیب کے خطبہ میں پند و نصیحت ہوگی۔ مقنّن کا قانون پائیدار ہوگا۔ منصف کا انصاف بے لاگ ہوگا۔ تاجر کی تجارت شفاف ہوگی۔ مسیحا کی مسیحائی کے چرچے ہوں گے۔ اور اگر عقل سلیم نہ ہوگی، قلب و ذہن بیمار ہوں گے تو جملہ شعبہ ہائے زیست میں نوحہ ہی نوحہ ہوگا۔ امن و آشتی اور نوید مسرت کی فاختاؤں کا نشیمن کہیں اور ہوگا۔ جسمانی اور روحانی طور پر صحت مند افراد ہی معاشرہ اور قوم کے معاشی و اقتصادی احکام کے ضامن ہوتے ہیں۔ ریاست اور حکومت ملک کو بیماریوں اور امراض سے محفوظ رکھ کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کر سکتی ہے کیونکہ جس ملک کی افرادی قوت مثالی ہوتی ہے اس کے تمام شعبے مثالی ہوتے ہیں۔ حکومت عوام کو صفائی کی اہمیت سے آشنا کر کے، گھروں میں سپرے کر کے مناسب تشہیر کے ذریعے، تعلیمی اداروں میں بیماریوں سے بچاؤ پر لیکچر کے ذریعے ہمہ قسم موذی امراض جیسے ٹی بی، تشنج، ہیپا ٹائٹس، شوگر، بلڈ پریشر، پولیو، ایڈز، کینسر اور ڈینگی سے محفوظ رکھنے کا فعال کردار ادا کر سکتی ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت حیطۂ امکان میں آ سکتا ہے، جب چھوٹے بڑے صغیر کبیر، امیر غریب، مرد عورت بیماریوں سے بچاؤ کے لیے حکومت کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوں، اور معاشرہ و قوم کو صحت مند بنانے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔

انسان جب بیماری کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تو بیماری کی شدت میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ بیماری کے حملوں میں وقفہ بڑھ جاتا ہے اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ بیماری ختم ہو جاتی ہے، انسان کی قوت ارادی اس کو صحت مند بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اگر وہ بیماری کے خوف کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے اور وہ بزعمِ خود موت کو قریب تصور کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح بیماری میں کمی آنے کی بجائے اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے بیماری کے دوران قوت ارادی کو مضبوط رکھنا انتہائی ناگزیر ہے۔

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
اس دور میں جینا لازم ہے جس دور میں جینا مشکل ہو

بیماری کے خاتمے اور بچاؤ کے لیے عوام اور ریاست کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ظلمات امراض کو صحت و تندرستی کے اجالے میں بدلنے کے لیے دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ماحول کو آلودگی سے بچانا، معیاری ادویات کی فراہمی، ملاوٹ سے پاک اشیاء کی مارکیٹ میں موجودگی کا انتظام کرنا، ہسپتالوں میں جملہ سہولیات کی فراہمی، اخبارات کے ذریعے، ٹیلی

ویژن اور ریڈیو پر آگاہی تعلیمی نصاب میں بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مضامین کا اندراج، زرعی پیداوار کے لیے خاص سپرے اور معیاری کھاد کی فراہمی کو یقینی بنانا۔ ان ہمہ قسم آسائشوں کی فراہمی اگر ریاست اور حکومت وقت کی ذمہ داری ہے تو عوام النّاس کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ وہ دست تعاون دراز رکھیں۔ اسی اسلوب پر عمل پیرا ہو کر ہی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی میں فرد، معاشرہ اور قوم کی صحت ہے۔

تندرست انسان کے چہرے پر رونق، خوبصورتی، تروتازگی اور شگفتگی کے آثار پائے جاتے ہیں، اس کے برعکس بیمار اور کمزور انسان کا چہرہ مرجھایا ہوا، غمگین اور اداس معلوم ہوتا ہے۔ انسانی ترقی کا دارومدار صحت پر ہے، اس کے بغیر نہ خدا کی عبادت ہو سکتی ہے اور نہ دنیا کا کوئی اہم کام سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی ملک اور قوم کی ترقی کا راز وہاں کے عوام کی اچھی صحت میں پنہاں ہوتا ہے۔

ہماری حکومت کو اپنے عوام کی فلاح کے لیے مزید راست اقدام اُٹھانے کی اشد ضرورت ہے۔ اگرچہ ڈینگی بخار کے خاتمہ کے لیے ہماری حکومت کا کردار مثالی ہے لیکن ڈینگی بخار کے علاوہ بھی تو کئی بیماریاں ہیں جنہوں نے ہمارے ملک کی مجموئی فضاء کو مکدر کر رکھا ہے۔ ان کے خاتمے کی طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ جسمانی بیماریوں کو ختم کرنے کے لیے شبانہ روز کوششیں جاری ہیں۔ لیکن وہ بیماریاں جو رشوت ستانی، اقرباء پروری، دھوکہ دہی، کساد بازاری، ڈاکہ زنی، ملاوٹ، فریب کاری، ناانصافی، کذب بیانی اور چاپلوسی کی صورت میں موجود ہیں اور ہمارے معاشرے اور ملک وقوم کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں ان کی طرف بھی توجہ کی اشد ضرورت ہے۔ تمام کلیدی آسامیوں ہر ایماندار اور صالح افراد متعین کیے جائیں۔ یونین کونسل کی سطح پر متعین افراد کو مقامی لوگوں کو پانچ وقتہ نمازی بنانے کے لیے ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ دیگر شعار اسلام کی طرف عوام الناس کی طبائع کو راغب کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ جسمانی عوارضات کا خاتمہ تو ادویات کے استعمال سے ممکن ہے۔ لیکن اندر چھپے یہ آستین کے سانپ امراض کے سروں کو صرف اور صرف احکام اسلام کی پابندی سے ہی کچلا جا سکتا ہے۔

فضا ہو گی مُعطّر گلشنِ وحدت کے پھولوں سے
کہ راشد مِل ہی جائے گی صحت دینی اصولوں سے

بیماری کے خاتمے کے لیے خلوص اور للّٰہیت کی اشد ضرورت ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا کی خاطر انتھک محنت اور جہد مسلسل انتہائی ناگزیر ہے۔ خلوص نیت سے لگایا ہوا شجر ہمیشہ بارآور ثابت ہوتا ہے اور جس عمل میں تصنع، نمود ونمائش اور بناوٹ کی

آمیزش ہو وہ پایہ تکمیل تک کبھی نہیں پہنچتا، اس لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ ہمارے عوام اور حکومت نیکی کر دریا میں ڈال کے جذبے کے تحت عوام الناس کو بیماری کے عفریت سے محفوظ رکھنے میں بے نظیر کردار ادا کریں۔ اور اسی میں ہماری بقاء ہے جو قومیں انسانیت کی خدمت کو اپنا وتیرہ بنا لیتی ہیں وہ صحت مند معاشرے کے قیام کا سبب بنتی ہیں اور آسمانوں پر ان کی عظمت کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

بدعنوانی کے خاتمے میں معاشرے کا کردار

کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ نے بے مقصد پیدا نہیں فرمائی، ہر چیز کی تخلیق میں کوئی نہ کوئی غرض و غایت ضرور کارفرما رہی ہے، لیکن انسان چونکہ ظلوماً جہولا کے مصداق تخلیق کردہ اشیاء میں کوئی نہ کوئی تبدیلی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے اور اس چیز کی تخلیق کا جو عظیم مقصد ہے وہ پس پردہ چلا جاتا ہے۔ اور یوں کائنات کی رنگینیوں، رعنائیوں اور دل آویزیوں کے آفتاب نصف النہار کو گرہن لگ جاتا ہے۔ کسی چیز کی اصل ہیئت کو تبدیل کرنے کا نام بدعنوانی ہے۔

مجاہد سرحد پر بجائے حفاظت کے جاسوسی کر رہا ہے تو یہ بدعنوانی ہے۔ معلم مسند تدریس پر متمکن ہو کر تشنگان علم کی پیاس بجھانے میں تساہل اور غفلت کا شکار ہے تو یہ تدریسی بدعنوانی ہے۔ مسیحا جب اپنے پیشے سے وفا نہیں کر رہا اور اس کے زیر علاج مریض کے مرض میں اضافے کا سبب اس کی نا اہلی اور ناتجربہ کاری ہے تو یہ گھناؤنا جرم اور کرپشن ہے۔ جس معاشرے میں ابتداء سے لے کر انتہاء تک بدعنوانی ہی بدعنوانی ہو اس معاشرے کی فضاء میں محو پرواز طائر خوش الحان بھی اپنی پرواز کو تادیر قائم نہیں رکھ سکتا۔ ایسے معاشرے کی مسموم فضاء اس کے تنزل کا باعث بنتی ہے۔

ہم اگر بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف قدم نہیں بڑھائیں گے تو اس کی جڑیں طول پکڑتی جائیں گی اور پھر اس ناسور پر نشتر چلانے کے لیے تادیر ہوم ورک کرنا پڑے گا۔ اس مرغِ بسمل

کی طرح تڑپاتے ہوئے زہر ہلاہل کے لیے کسی تریاق کی اشد ضرورت ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والا شخص اس کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کمر بستہ ہوجائے ، صحافی اپنے اخبار میں کرپشن اور بدعنوانی کے خلاف مضامین اشاعت کر کے اس لعنت سے چھٹکارے کے لیے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ خطیب اپنے خطبہ میں بجائے فرقہ واریت کو ہوا دینے کے بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف مدلل دلائل دے کر اس قبیح برائی سے نجات کا سبب بن سکتا ہے۔ تاجر اپنے کاروبار میں ایمانداری کا مظاہرہ کر کے اس لعنت کے خاتمے میں اپنا وافر حصہ ڈال سکتا ہے۔ عدل وانصاف کی کرسی پر صدر نشین جج اپنے مقدمے کی تیاری اور فیصلے سنانے تک کے تمام مراحل میں عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ کر کرپشن کے خانے میں احسن کردار ادا کر سکتا ہے۔

معاشرے کے تمام افراد اگر ایکا کریں تو ملاوٹ، اقربا پروری، رشوت ستانی ،تعصب، دھوکہ دہی، کذب بیانی، فریب کاری، چوری، ڈاکہ زنی جیسی خصائل قبیحہ جو کہ کرپشن کی بدترین صورتیں ہیں کی ناؤ کو کنارے لگنے سے روکا جا سکتا ہے۔ یہ کام ہمارے لیے انتہائی ناگزیر ہے اور ہم نے اس کے لیے جہد مسلسل کرنی ہے۔ اور آج اگر ہم نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

☆☆☆☆☆☆☆

میرا استاذ

دنیا کے اندر مختلف نسل، مختلف قوم، مختلف مذاہب، مختلف رنگ اور مختلف نظریات کے لوگ رہائش پذیر ہیں، ہر ایک اپنے اپنے نظریے، اپنے اپنے مذہب، اپنے اپنے رسم و رواج اور اپنے اپنے طریقہ کار کے تحت ایامِ زیست گزار رہا ہے، معاشرے میں فلاحی ورکر کا اپنا کردار ہے، اسمبلی کے ممبر کا اپنا کردار ہے، کرسی عدالت پر متمکن منصف ذیشان کا اپنا کردار ہے، ایماندار تاجر کا اپنا کردار ہے، ہنرمند فنکار کا اپنا کردار ہے، دولت مند ساہوکار کا اپنا کردار ہے، ہوشمند اداکار کا اپنا کردار ہے، سرحدوں کے محافظ کا اپنا کردار ہے، تہجد گزار عابد کا اپنا کردار ہے، اطاعت گزار ساجد کا اپنا کردار ہے، جامع مسجد کے خطیب کا اپنا کردار ہے، اچھے مصنف اور ادیب کا اپنا کردار ہے، ''یعنی ہر گُلِ را رنگ و بوئے دیگر است'' ہر پھول کی خوشبو اور رنگ علیحدہ علیحدہ ہے لیکن ان میں جس بات پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ذوی العقول اور حیوان ناطق ایسا نہیں کہ جس کا کوئی نہ کوئی استاد نہ ہو کوئی رہبر و رہنماء نہ ہو، کوئی ہادی و مرشد نہ ہو!۔

شومیکر اگر جوتا بناتا ہے تو اس میں بھی کسی استاد کا ہاتھ ہے، ٹیکسٹائل مل کا مالک اگر کپڑا بنتا ہے تو وہ بھی استاد کا مرہونِ منت ہے، تاجر ہو یا صنعت کار، پٹواری ہو یا تحصیلدار، اکاؤنٹنٹ ہو یا بینکار، مزارع ہو یا جاگیردار، زمیں پر چلنے والا ہو یا محو پرواز یہ سب کے سب ٹیچر اور مدرس کے لگائے ہوئے نخل ہیں جو اب سروقد ہو چکے ہیں۔ ان سے جہالت اور بے علمی

کے خس و خاشاک کو صاف کر کے محنت اور مشقت کا پانی دے کر پروان چڑھانے والی اگر اللہ تعالیٰ کے بعد کوئی ذات ہے تو وہ استاد کی ذات ہے۔

استاذ ایک نابغۂ روزگار ہستی ہے، کوئی کج فہم، کور ذوق اور بدفطرت استاذ کے وجود اور اس کے مقام و حیثیت سے انکاری نہیں ہوسکتا ہے ورنہ ٹیچر کے مقام سے تو ایک طفلِ مکتب بھی بخوبی واقف ہے۔ ارباب علم و دانش کا قول ہے کہ ''باپ انسان کو آسمان سے زمین پر لاتا ہے اور استاذ (ٹیچر) انسان کو زمین سے آسمان پر لے جاتا ہے۔ استاذ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہستی جس کے بارے میں ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے معلم (ٹیچر) بنا کر بھیجا گیا ہے ''اس کائنات کی ٹھاٹھ باٹھ اس کا قد کاٹھ، اس کی رنگینیاں، اس کا حسن و جمال، اس کی سج دھج یہ سب کسی نہ کسی استاد کی بدولت ہے۔

غزالی نے فلسفیانہ الجھنوں کو سلجھایا تو کسی استاد کے صدقے، رازی نے مناظرے کیے اور کامیابی حاصل کی تو استاد کے صدقے، ابنِ خلدون نے تاریخ میں نام پیدا کیا تو استاد اور ٹیچر کے طفیل، ابنِ زیدون نے ادب میں نام پیدا کیا تو استاد کے طفیل، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم الامت کا لقب حاصل کیا تو استاد کی بدولت، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، عبداللہ بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابوبکر صدیق حتیٰ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مقام مرتبہ تک پہنچے تو استاد ذیشان کی بدولت، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استاد اللہ تعالیٰ خود ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''وہ رحمٰن ہے (اللہ تعالیٰ) جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کی تعلیم دی۔

میرا ٹیچر صرف ایک لفظ ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک مفاہیم کا انبار لیے ہوئے ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے استاد کو اس مقام کے مطابق احترام دے تو اس سے نہ صرف صحتمند معاشرہ وجود میں آئے گا۔ بلکہ عوام النّاس میں صفاتِ محمودہ پیدا ہوجائیں گی اور زندگی کے گلستان میں بہار آجائے گی۔

اساتذہ کا وجودِ مسعود نعمتِ غیر مترقبہ ہے، مُرورِ ایّام کے ساتھ ساتھ یہ چاند بھی گہنا گیا ہے۔ اساتذہ بھی اگر سابقہ دور کے اساتذہ کے نقشِ قدم پر چلیں تو آج بھی وہ غزالی، رازی، اقبال، حالی اور نامور ہستیاں پیدا کرسکتے ہیں۔ کسی حد تک درست ہے کہ آج نہ صدیوں پہلے والے استاد ہیں

اور نہ ہی شاگرد ہیں، ہمیں اپنے آپ کو نکھارنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ساتھ سلف صالحین کے طریقہ کار کو اپنانا ہوگا۔ ہماری حکومت جو دیگر ایام کے ساتھ ساتھ (ٹیچر ڈے) مناتی ہے یہ ایک مستحسن قدم ہے۔ آج اگر کوئی جس منصب پر بھی فائز ہے تو یہ بات اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ دل و جان سے ہوش و حواس سے، قلب و روح سے یہ کہے کہ ان بلندیوں پر، ان رفعتوں پر اگر کوئی پہنچانے والا ہے تو وہ ''میرا ٹیچر'' ہے۔

رحمت و رافت میرا ٹیچر
مہر و اُخوّت میرا ٹیچر

آبی وسائل کی اہمیت

آب سے مراد پانی ہے اور پانی زندگی کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر اس کا وجود عنقاء ہو جائے تو زیست و حیات بھی نہ رہے اور یہ زندگی کی ناؤ بحرِ ظلمات میں ہچکولے کھانا شروع کر دے۔ پانی عناصر اربعہ میں سے اہم جزو ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا فرمایا'' پانی کی اہمیت اس سے مترشّح ہو رہی ہے۔ ہمارے ہاں آبی وسائل کی اہمیت بہت زیادہ ہے ہماری معیشت کا زیادہ سے زیادہ دارومدار آبی وسائل پر ہے۔ آبی وسائل میں سب سے اہم وسیلہ اور ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جو بارش کی صورت میں ہم پر نازل ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر گلیشیر بنتے ہیں، پھر وہاں سے دریا، بحر، بحیرے، ندی نالے، نہریں اور سمندر وجود میں آتے ہیں، تالاب، جھیلیں، ٹیوب ویل یہ سب آبی وسائل ہیں۔ پانی کی اہمیت مزید اس بات سے واضح ہو رہی ہے کہ زمین پر تین حصے پانی ہے اور ایک حصہ مٹی ہے۔

ہمارا نہری نظام دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام ہے، پانی کی اہمیت تسلیم کرنے میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ دنیا کا ہر مذہب، ہر مسلک، ہر قوم، ہر معاشرہ اور تمام ممالک اس بات کے معترف ہیں کہ پانی انسانی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پانی کا استعمال صرف پینے کی حد تک نہیں ہے بلکہ کم و بیش دنیا کی اکثر اشیاء کا وجود میں آنا ناممکن ہو جائے اور زندگی محال ہو جائے اگر پانی نہ ہو۔

آبی وسائل میں سب سے اہم ذریعہ نہروں کا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارش کا نزول ہوتا ہے تو وہ گلیشیر کی صورت میں پانی کے قطرے جم جاتے ہیں اور پھر تپش سے اور موسم گرما میں گرمی کی حدت سے پگھل کر ندی نالوں اور نہروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں نہری نظام کھیتی باڑی میں اور زراعت میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں کشت زعفران کا نمونہ پیش کرنے والے لہلہاتے کھیت سرسبز وشاداب فصلیں، گلہائے رنگارنگ، خس و خاشاک سے پاک سبزہ، سروقد شجر، چشموں کے ساتھ لٹکے ہوئے حجر، کسان کے چہرے پر تازگی، مزدور کے چہرے پر رونق، مریض کے چہرے کی بشاشت سب انہی آبی وسائل کی مرہون منت ہے۔

پانی کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہے تو ان ممالک سے پوچھیں جو سمندر کے کناروں پر موجود ہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں مزدور شعبہ ماہی گیری سے وابستہ ہیں اور اس پیشے سے منسلک ہو کر اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھر رہے ہیں، پھر یہ وسائل ذرائع آمدورفت کا بڑا اہم ذریعہ ہیں، بحری جہازوں کے ذریعے سامان درآمد و برآمد کیا جاتا ہے اور زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ بات جاتی ہے کہ پانی صرف پینے اور پیاس بجھانے کی صورت میں ہی نافع ہے اس کا کوئی اور فنکشن نہیں ہے یہ ہماری خام خیالی ہے۔ جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پانی اگرچہ روئے زمین پر تین حصے ہے لیکن اس کے باوجود صرف 2 فیصد پینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ہم پر کتنا فضل وکرم ہے کہ مہنگائی کے دور میں بھی پانی جیسی عظیم نعمت ہمیں وافر مقدار میں دستیاب ہے اگرچہ ہمارے ارباب حل وعقد کی لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے بعض مقامات پر ہم صاف پانی سے محروم ہیں اور لوگ پانی کے استعمال کے لیے میلوں کی مسافت طے کر کے پانی لے کر گھر پہنچتے ہیں۔

پانی کی اس لازوال نعمت سے نہ صرف بنی نوع انسان فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ آبی جانور بھی مستفید ہوتے ہیں۔ پانی جب بارش کی صورت میں برستا ہے اور محو پرواز طائر خوش نوا جب اپنی چونچ کا رخ آسمان سے برسنے والی بارش کی طرف کرتا ہے اور پھر بارش کا آلودگی سے پاک قطرہ اس رفع منقار کرنے والے طائر خوش نواء کی چونچ میں پڑتا ہے اور اس کے جسم وجان سے اللہ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے تو پوری فضا اس مسحور کن ماحول کا مرکز بن جاتی ہے۔ بارش سے شجر

وحجر، پر موجود گرد صاف ہو جاتی ہے اور ماحول نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ بارش کے بعد تالابوں، جوہڑوں، ندی نالوں پر قوسِ قزح کی موجودگی میں طویل ٹانگوں اور لمبی گردنوں والے آبی پرندے بارش کا پانی پیتے ہوئے ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔

آبی وسائل خواہ بارش ہو، گلیشیر ہوں، نہریں ہوں، دریا ہوں، سمندر ہوں، جھیلیں ہوں، سب انسانی ضروریات کے لیے جزو لاینفک ہیں اور کوئی ملک خواہ کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو ان کی اہمیت سے انکاری نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ ہمارے ملک جیسا ترقی پذیر ملک۔

☆☆☆☆☆☆☆

کیا توانائی کے بحران کا حل ہمارے بس میں نہیں

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سلیم عطا فرمائی ہے اور اشرف مخلوقات بنایا ہے دیگر تمام مخلوقات سے زیادہ عزت وعظمت انسان ہی کو عطا فرمائی ہے۔ وہ اپنے ظاہری حواسِ خمسہ کے ساتھ ساتھ باطنی حواس کو بھی استعمال میں لاکر قابلِ صد افتخار کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی قوت لایموت کا حامل ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عظیم قوت کے باعث ناقابل یقین امور کی انجام دہی میں سرفہرست رہتا ہے۔ اور بڑے بڑے لاینحل مسائل اپنا حل خود ہی پیش کر دیتے ہیں لیکن عظمِ صمیم اور استقامت جیسی صفاتِ محمود سے متصف ہونا انتہائی ناگزیر ہے۔ جرأت، استقامت، عزم صمیم، یقین کامل اور عمل پیہم جیسی شمشیروں سے مسلح مجاہد جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بخوبی سرانجام دے سکتا ہے اور راستے میں آنے والی جملہ رکاوٹیں خس و خاشاک کی طرح ختم ہو جاتی ہیں۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیئت سے رائی

توانائی کے بغیر زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنا خام خیالی ہے، پلک جھپکنے سے جوئے شیر نکالنے تک جملہ امور کی انجام دہی کے لیے توانائی جزو لاینفک ہے۔ امورِ خانہ داری سے لے کر امورِ مملکت کے نپٹانے تک توانائی کی افادیت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ توانائی کے بحران کا

حل ہمارے پاس کیوں نہیں ہے، ہمارے پاس اس کا حل بدرجہ اتم موجود ہے لیکن توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمارا معلم اپنے طالب علم کو اچھی تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کی صحیح خطوط پر کتر بیونت کے جذبے، اس کو معاشرتی اقدار سے آگاہی کے ذریعے، اس کو معاشی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر ہدایات کے ذریعے توانائی کے جملہ شعبہ ہائے زیست سے آشناء کرسکتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے نصاب میں اگر توانائی کے بحران کے حل کے مضامین درجہ وار شامل کر دیئے جائیں اور اس کی افادیت سے طلباء کو باخبر کر دیا جائے تو یہ آنے والی نسل کے لیے سودمند ثابت ہوں گے۔ اور دیگر شعبوں کے لیے یہ مہمیز ثابت ہوگی۔ استاذ معمار قوم ہوتا ہے اس کی بھٹی میں گرم ہونے والا حدید اپنے اندر ہر قسم کی تبدیلی کی گنجائش رکھتا ہے۔

ہم جب ذہنی طور پر مستعد اور کمر بستہ ہو جائیں، تو پھر مشکل اور ناممکن کام کو ممکن اور آسان بنا دیتے ہیں۔ کسان اگر اپنی کھیتی کو کشتِ زعفران بنانا چاہتا ہے تو وہ اعلیٰ قسم کے بیج استعمال کرتا ہے، جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے اپنی فصل کو معیاری بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ زراعت ہماری معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اگر ہماری فصل اچھی ہو جائے تو ہم اپنی درآمدات اور برآمدات کو بڑھا سکتے ہیں۔ اور برآمدات میں اضافے سے بین الاقوامی طور پر ہم ایک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اور توانائی کے بحران پر قابو پانے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔

کفایت شعاری کو اگر ہم حرزِ جاں بنالیں تو اس سے بھی توانائی کے بحران پر قابو پانے میں معاونت حاصل کی جاسکتی ہے۔ کفایت شعاری اور اعتدال اگر برقی رو کے استعمال میں آ جائے تو توانائی کے حصول میں رکاوٹ کھڑی نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے رائے عامہ کو بھی ہموار کرنا ہوگا۔ عوام کو آگاہی اور شعور کی دولت سے مالا مال کرنا ہوگا۔ اگر برقی رو کے استعمال میں اعتدال آجائے تو برقی توانائی کا بحران ختم ہوسکتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے ''بہترین کام میانہ روی ہے'' میانہ روی کی عادت اگر ختم ہو جائے تو پھر بحرانوں کا دروازہ وا ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ خصلت عادتِ ثانیہ بن جائے تو پھر انسان بڑے بڑے اونچے پہاڑوں کے سامنے بھی سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اگر فضول خرچی جیسی قبیح عادت کا وہ خوگر ہو جائے تو پھر ریت بھی اس کو

پتھر نظر آتی ہے۔

توانائی کے بحران کا حل ہمارے بس میں بالکل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں ارباب حل وعقد کو منظر عام پر آنا ہوگا۔ حکومتی سطح پر عوامی آگاہی کے لیے انتظام وانصرام کرنا ہوگا۔ اخبارات کے ذریعے اشتہارات دے کر شعور وآگاہی کے دروازے کو وا کرنا ہوگا۔ صحافی حضرات کو اپنے قلم کو جنبش دینا ہوگی۔ مضمون نگار اپنے مضامین کے ذریعے توانائی کے بحران پر قابو پانے میں اپنے قویٰ صرف کرتے رہیں۔ قلمکار اچھی اور سستی کتب کی تصنیف کر کے اپنے خیالات کو عوام الناس تک بہم پہنچانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں۔ توانائی، طاقت، قوت، ہمت کا دوسرا نام ہے۔ جہاں بھی طاقت کی ضرورت ہوگی وہاں گویا توانائی کی ضرورت ہوگی اور بغیر توانائی کے زندگیوں کی بہاریں ٹوٹنا ناممکن ہے۔ جو چیز ہر شعبے میں درکار ہو اس کے حصول کے لیے سر توڑ کوشش، شبانہ روز جدوجہد، انتھک محنت اور پیہم کدّ وکاوِش کی اشد ضرورت ہے۔

توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے ہمارے جو منصوبے التواء کا شکار ہیں وہ پایہ تکمیل تک پہنچائے جائیں، ڈیم بنائے جائیں، شمسی توانائی کو وسعت دی جائے، پرائیویٹ سیکٹر کو اجازت دی جائے کہ وہ بجلی کے بحران پر قابو پانے میں دستِ تعاون دراز کریں اور اسی طرح جو شخص بجلی کم استعمال کر کے ملک وقوم کے لیے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہو، اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اس کو انعامات سے نوازا جائے۔ بجلی چوری کر کے زندگی گزارنے والے لوگ جو معاشرے کے لیے ناسور ثابت ہو رہے ہیں انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ انرجی سیور کی طرح دیگر ایسے منصوبے سامنے لائے جائیں جو توانائی کے بحران میں مدد ومعاون ثابت ہوں، سادگی کو رواج دیا جائے یہ ایک ایسی عظیم خصلت صالحہ ہے کہ صرف اس خصلتِ کو اپنانے سے 50% فیصد توانائی کے بحران کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے، سادگی کے ساتھ اور حصول مقصد کے لیے جذبہ صادق ہو، عمل پیہم ہو، شبانہ روز جدوجہد ہو، انتھک محنت ہو، سعی مسلسل، لگاتار کدوکاوش ہو اور اپنے ہدف کے لیے تمام عوامی وسرکاری ذرائع استعمال میں لائے جائیں تو توانائی کے بحران کے حل پر بحسن وخوبی قابو پایا جاسکتا ہے، عزمِ صمیم اور جہد مسلسل کی ضرورت ہے کیونکہ بارش کے قطرے اگر مسلسل اور لگاتار گرتے رہیں تو ریگستانوں میں بھی سیلاب آجاتا ہے۔ آج اگر ہم بھی تہیہ کرلیں کہ توانائی کے بحران پر قابو پانا ہے تو وہ دن دور نہیں کہ قوت اور توانائی کا

عقاب فلک کی بلندیوں پر محو پرواز ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

دہشت گردی ایک المیّہ ہے

بھلا بے دخل ہو کیوں کر مکاں اپنے مکینوں سے
وہ دہشت گرد بن جاتے ہیں جن کے گھر نہیں رہتے

دہشت گردی کا لفظ گذشتہ چند سالوں سے ہمارے معاشرے میں اتنا استعمال ہونے لگا ہے کہ اس سے خوف و ہراس کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ جس لفظ کے ساتھ اس کا لاحقہ اشتراک کرتا ہے وہ زیادہ نقصان دہ ہو جاتا ہے اگر یہ لفظ وکیل کے ساتھ استعمال ہوتو قانونی دہشت گردی، محلے کے ساتھ استعمال ہوتو محلاتی دہشت گردی، لفظ دہشت گردی خوف و ہراس کی علامت بن چکا ہے۔ دہشت گردی ایک المیّہ ہے وہ معاشرہ، وہ قوم، وہ ملک جو پسماندگی کی کیفیت سے دوچار ہو اور کئی المیے جس کے حسن کو گہنا رہے ہوں، اس کے استحکام کو متزلزل کر رہے ہوں۔ اس کی فلک بوس عمارتوں کو مسمار کر رہے ہوں تو وہ قابلِ رحم ملک ہے۔ ہمارے ہاں المیوں کا جم غفیر ہے جو ہمارے مسلم معاشرے کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے درپے ہیں۔ ہمارے ہاں عصبیت ایک المیہ ہے، اقربا پروری ایک المیہ ہے، کرپشن ایک المیہ ہے، رشوت ایک المیہ ہے۔ منافقت ایک المیہ ہے، بے جا مخالفت ایک المیہ ہے اور اس وقت جس نے ہماری کمر توڑ کر رکھ دی ہے وہ مہنگائی کا المیہ ہے۔ ان سب المیوں سے زیادہ خطرناک، زیادہ ہیبت ناک، زیادہ خوفناک، زیادہ اندوہناک المیہ دہشتگردی کا ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے عوام الناس کا آرام وسکون برباد کر رکھا ہے۔ کوئی جان کسی حال میں بھی محفوظ نہیں

ہے۔گھر، بازار مسجد، مزار کوئی جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔

اسلام امن پسند مذہب ہے، مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ امن وسلامتی کا علمبردار ہے، رواداری، مروت، فرض شناسی، راست گوئی، عدل وانصاف، مساوات اور اخوت کا خمیر اس کی سرشت میں شامل ہے اور یہ اپنے پیروکار میں خصائلِ حمیدہ پیدا کرنے کا شدت سے متمنی ہے۔ اسلام کے ارکان خمسہ اور جملہ عبادات ایک عدل وانصاف پر مبنی اور دہشت وخوف سے معرا ملت وقوم کی تعمیر کی خواہاں ہیں۔

اشرف المخلوقات کے اعزاز سے معزز شخص کبھی دہشت گردی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ دہشت کا لفظ ہی ایسا ہے کہ اس سے کراہت، نفرت اور گھن کا تصور ابھرتا ہے اور ایک صحت مند اور سلیم دماغ متعفّن ہو جاتا ہے۔ دہشت گردی کے تصور سے جو بات ایک عام شخص کے ذہن میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ چند عاقبت نا اندیش افراد پر مشتمل گروہ گھناؤنی شکل بنائے مختلف النوع اسلحہ سے مسلح ہوکر سادہ لوح لوگوں کو کچلنے کے درپے ہیں۔

اسلام کے زیور سے مرصّع شخص تو ایسی گھناؤنی حرکات کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ظلم واستبداد بھی دہشت گردی کی ایک شکل ہے۔ عدل وانصاف کا فقدان دہشت گردی کی ایک قسم ہے، اگر کوئی اسلام کے ابدی اصولوں سے منور چراغ اپنے گھر میں نہیں روشن کرتا تو وہ خانگی دہشت گردی کا شکار ہے۔ اگر کوئی محلّہ کے اندر کوئی قابل قدر کام سرانجام نہیں دیتا تو وہ محلاتی دہشت گردی کا شکار ہے۔ ملک وقوم کی خدمت نہ کرنے والا شخص اگر دہشت گرد نہیں بھی ہے تو دہشت گردی کے قریب ضرور ہے۔

دنیا پر موجود ممالک جو ترقی پذیر ممالک کا استحصال کر رہے ہیں وہ پسماندہ ممالک کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ صرف ان کی ظاہری حیثیت کے خاتمے کے درپے ہیں بلکہ ان کو نظریاتی طور پر بھی مفلوج کرنے کے آرزومند ہیں۔ آج ہمارا جو حشر ہو رہا ہے اسلام سے دوری کا نتیجہ ہے۔ تقریباً 57 ممالک اسلام کے تاج کو اپنے سر پر سجا چکے ہیں۔ انہوں نے صرف ظاہری طور پر اسلام کے لیبل کو اپنے اوپر لگایا ہوا ہے۔ وہ اسلام کے عالمگیر نظامِ حیات سے ناآشنا ہیں۔ بنابریں وہ آئے روز قعرِ مذلت میں گرتے جا رہے ہیں۔

حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے:۔

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں''

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثِ پاک سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہورہی ہے کہ مسلمان کے ہاتھ اور زبان سے کبھی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ ہر چیز کی ایک شناخت ہوتی ہے، سورج کی شناخت یہ ہے کہ وہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے، ستاروں کی شناخت یہ ہے کہ وہ آسمان پر چمکتے ہیں، سبزہ کی شناخت یہ ہے کی وہ زمین پر سبز مخمل کی چادر کی صورت میں چشم بینا کی طراوت کا سبب بنتا ہے، درختوں کی شناخت یہ ہے کہ وہ صحراؤں میں لہرا کر گلستانوں میں جھوم کر، آلودگی کا سد باب کر کے اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں، پھولوں کی شناخت یہ ہے کہ وہ چمن میں باغباں اور گل چیں کے ہاتھوں کی زینت بنتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان کی بھی شناخت ہے کہ اس کے ہاتھوں اور زبان سے دوسرے مسلمان مامون ومحفوظ رہتے ہیں۔

دہشت گردی کا سدِ باب صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسلام میں بحکمِ خداوندی پورے پورے داخل ہوجائیں اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا جائے۔ ایک مسلمان کا معاشی تحفظ، معاشرتی معیار، اخلاقی بلندی صرف اور صرف احکامِ الٰہی کی پیروی میں مضمر ہے۔ اگر ہم اسلام سے دور ہوتے گئے اور دہشت گردی کی بھینٹ چڑھتے گئے تو یہ سب ہمارے اعمال ہی کی بدولت ہوگا۔

خود عمل تیرا ہے صورت گر تری تقدیر کا
شکوہ کرنا ہو تو اپنا کر ، مقدر کا نہ کر

دہشت گردی واقعی ایک المیہ ہے لیکن اگر کسی مصیبت کو، کسی پریشانی کو سر پر سوار کرلیا جائے تو وہ ترقی کی راہ میں سدسکندری ثابت ہوتی ہے اور پھر اس سے راہِ فرار ناممکن ہوجاتی ہے۔ اس وقت ہماری حکومت کی کاوشیں قابل دیدہ ہیں لیکن اس کی مساعی جمیلہ کو کامیاب بنانے کے لیے ہمارے تعاون کی بھی اشد ضرورت ہے، دہشت گرد کا کوئی مسلک اور مذہب نہیں ہوتا اور اس کی گھناؤنی سازش کا شکار کوئی خاص گروہ یا فرقہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کی سازشوں کو ناکام کرنے کے لیے ہمیں سخت جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ملک پاکستان سے تعلق رکھنے والا اس صورت میں سچا پاکستانی ہوسکتا ہے، جب اس کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی اور ایثار اس کی اوّلین خواہش ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طِلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

معاشرہ وہی مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے جس میں عدل و انصاف، مساوات، اخوت و ہمدردی، مرّوت، بھائی چارہ جیسی اخلاقی صفات عروج پر ہوں اور بے راہ روی، اقرباء پروری، رشوت ستانی، انارکی جیسی غیر اخلاقی اور خصائل قبیحہ کا قلع قمع ہو چکا ہو ایسے معاشرے کا وجود پوری انسانیت کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتا۔ اور ایسے معاشرے کے وجود کے استحکام کے لیے آسمانی مخلوق کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دیتی بلکہ اس خطہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی آگے بڑھتے ہیں اور حسنِ معاشرہ میں مشاطگی کرتے ہوئے عظیم سے عظیم تر اقوام کی تخلیق کا سبب بنتے ہیں۔ خداداد صلاحیت کے حامل لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رضا کی خاطر یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

مُصَلّا بیچ کر خنجر خرید اے زاہدِ ناداں
فقیری سے تری ٹکرانے کو یہ بادشاہی ہے

حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے کہ اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے منع کرے، اگر وہ اپنے آپ کو اس اہل نہیں سمجھتا تو پھر اپنی زبان سے منکرات کی مخالفت کرے اور پھر اگر وہ ایسا کرنے سے بھی اپنے آپ کو قاصر تصور کرتا ہے تو پھر اپنے دل سے ہی اس کو برا جانے اور یہ اس کے کمزور ایمان کی علامت ہے۔

برائی سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ شراب خانہ پر نظر پڑے تو برائی ہے، چور کو چوری

کرتے دیکھو تو یہ برائی ہے، ڈاکو کو ڈاکہ زنی میں پاؤ تو یہ برائی ہے، راشی کو رشوت جیسی قبیح عادت میں ملوث پاؤ تو یہ برائی ہے، بلکہ وہ ہر چیز جو تمھارے دل میں کھٹکا پیدا کرے کہ اگر اس سے عوام النّاس مطلع ہو جائیں تو تمھارے لیے رسوائی ہے اس کو بھی برائی میں ہی گردانا جاتا ہے، اور برائی سے اجتناب ہی صحت مند معاشرے کے قیام اور استحکام میں معاون ہے۔ خصائل حمیدہ سے نیکیوں کے پھول کھلتے ہیں، اور ان گلہائے رنگارنگ کی خوشگوار مہک قلب اِذہان میں طراوت اور تازگی کا باعث بنتی ہے۔ خیر کے آب حیات سے پروان چڑھنے والے شجر سایہ دار کے نیچے ستانے والے حیوان ناطق کی دنیا و آخرت سنوارنے میں کسی مصنوعی سورج کی دھوپ سد سکندری ثابت نہیں ہوسکتی۔ گلشنِ صالح کی فضاء اور مہک کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے جو تعفن زدہ ذہن کی بیماری کو دور کرنے میں مسیحا ثابت ہوتا ہے۔

گھر کا ماحول درست ہوگا، خیر و شر کی تمیز ہوگی، نیک اور بد میں فرق نمایاں ہوگا، گھر کا سربراہ قُم فَاَنْذِرْ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر عمل پیرا ہونے کی صفت سے متصف ہو کر اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی ہولناکیوں سے خوف زدہ کرتے ہوئے لمحات زیست گزار رہا ہوگا۔ تو پھر ایسی فضاء تطہیر میں محو پرواز طائر کی اڑان منفرد ہوتی ہے۔ ایسی زمین میں اگنے والے پودے کی افزائش کو خس و خاشاک کی آلودگی متاثر نہیں کرسکتی۔ برائیوں اور خصائل قبیحہ اور شنیعہ کے خاتمے کے لیے ہر شعبے میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر اس معاملے کو پس پشت ڈال دیا گیا تو پھر آئے دن معاملات گھمبیر ہو سکتے ہیں جن کو سنبھالنا ناممکن ہے۔ برائی کے خاتمے کے لیے جھوٹ کے نتائج سے آگاہ کرنے کے لیے۔ بدکاری، زنا کاری، نسل پرستی، تعصب، اقربا پروری، ظلم و بربریت، دہشت گردی، اغواء برائے تاوان، ملاوٹ جیسی غیر اخلاقی عادات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر پلیٹ فارم سے شدید احتجاج کی ضرورت ہے۔ سادہ لوح انسان کو آگاہ کرنے کے لیے ہر ایک کو قدم بڑھانا ہوگا۔ استاد اپنے طلبا کو، خطیب اپنے ممبر پر بیٹھ کر وعظ و نصیحت کے ذریعے، جج کرسی انصاف پر متمکن ہو کر، تاجر دوران تجارت وابستہ افراد سے، مجاہد سرحدوں کی حفاظت کے دوران برائی کے قلع قمع کے لیے کوشاں رہے گا۔ پیر اپنے مرید کی صحیح تعلیم و تربیت کر کے برائی کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے میں معاونت کرے گا۔ مرشد اپنے مریدین کی تربیت اسی صورت میں کر سکے گا جب وہ خود حجرہ نشینی کو چھوڑ کر میدان عمل میں قدم رکھے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت اگر حلوہ کھانا ہے تو میدان طائف میں دوران

تبلیغ دین پتھر کھانا بھی سنت ہے۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہر شعبے میں تبلیغی خدمات سرانجام دینا ہوں گی، زمین کے کسی خطے کو سجادگی کے شرف سے مشرف کرنے سے دین کے جملہ تقاضے بھی پورے نہ ہوں گے۔ اس کے لیے ہر شعبہ حیات سے تبلیغی وابستگی انتہائی ناگزیر ہے، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے کہ:۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

تندرستی ہزار نعمت ہے

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی تخلیق فرمائی تو اس کو بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان، بولنے کے لیے زبان، چکھنے کے لیے قوت ذائقہ، سونگھنے کے لیے قوت، چلنے کے لیے قوت، سوچنے کے لیے قوت، غور وفکر کے لیے قوت یعنی انسان کو قوائے جسمانی کی صورت میں انعاماتِ ربانی وافر مقدار میں میسر آئے۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو تم ان کو گنتی میں نہیں لا سکتے ہو، ان بے شمار نعمتوں کا درود بنی نوع انسان کے لیے ہوا ہے اور انسان وہ ہے جو جسم اور روح کا مرکب ہے اگر انسان صحت مند ہے تو یہ جملہ انعاماتِ ربانی اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہیں اور اگر مرد بیمار ہے تو وہ ہر نعمت سے بیگانہ ہے، ہر نعمت اس کے لیے غیر مفید ہے، ہر نعمت اس کے لیے نعمت نہیں بلکہ زحمت ہے، ہر نعمت کا وجود اس کے لیے غیر محمود ہے۔

انسان گلستانِ سرسبز میں گلہائے رنگارنگ کے حسین وجمیل مناظر سے متمتع ہوسکتا ہے لیکن چشمائے انسانی میں بینائی شرط ہے، انسان کوئل کی مسحور کن آواز سے، قاری قرآن کی تلاوت سے، خطیب ممبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش الحانی سے، واعظ شیریں لسان کی شعلہ بیانی سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ قوت سماعت جو بن پر ہو، اعضائے جسمانی کی سالمیت تکمیل انسانیت کے لیے اہم کردار ادا کرتی ہے۔

صحت مند انسان معاشرے کا اہم رکن ہوتا ہے۔ گھر کے لیے، خاندان کے لیے اس کا

وجود کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا، اس کی نشست و برخاست معیاری ہوتی ہے، وہ حسن و زیبائش کا مرقع ہوتا ہے، وہ انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہوتا ہے، وہ بصارت کے ساتھ ساتھ صاحبِ بصیرت بھی ہوتا ہے، وہ صحت مند جسم کے ساتھ ساتھ صحت مند دماغ کا بھی مالک ہوتا ہے، اس کی سوچ مثبت ہوتی ہے، اس کے خیالات و نظریات تعمیری ہوتے ہیں، اس کے جذبات ہیجانیت سے معرا ہوتے ہیں۔

حُسنِ صحت کی دولت سے مالا مال شخص جب کھیت و کھلیان میں قدم رکھتا ہے تو اس کے کھیت کشت زعفران کا نمونہ پیش کرتے ہیں، اگر وہ سرحدوں پر مامور ہوتا ہے تو لوگ خواب خرگوش کے مزے لیتے ہیں، اگر فضائی مسافروں کا قائد اور رہنما ہوتا ہے تو اس کی اڑان میں استحکام اور استقرار ہوتا ہے۔ یہ سب کس لیے ہے یہ صرف اور صرف اسی لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تندرستی کی لازوال دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے۔ اس کو صحت و توانائی کی رنگینیاں میسر ہیں۔ اس کے آنگن میں حسن صحت نے بیماری، لاچاری اور لاغرپن کی تاریکیوں کو یکسر ختم کر دیا ہے اور گھر کا ہر کونہ کھدرا امن و عافیت کے قمقموں سے منور و مستنیر ہے۔

حدیث پاک میں ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''العقل السلیم فی الجسم السلیم'' کے صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ جسم کو صحت مند اور توانا رکھنے کے لیے صحت مند عادات اپنانا ہوں گی۔ رات تا دیر جاگتے رہنے سے پرہیز کرنا ہوگا، صبح جلدی اٹھنا اپنی عادت بنانا ہوگا، روزانہ غسل اور مسواک پر عمل کو یقینی بنانا ہوگا۔ ناخن کاٹنا، بال تراشنا، کپڑوں اور جسم کی صفائی جہاں جسمانی طور پر انسان کو مضبوط بناتی ہے وہاں اس کے ظاہری حسن میں بھی رنگ بھر دیتی ہے۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ انسان جو جسمانی صحت کے ساتھ روحانی طور پر بھی مثالی صحت کا مالک ہوتا ہے، جس کا ظاہر باطن ایک ہوتا ہے، جس میں منافقت کی متعفن بُو کلیتًا مفقود ہوتی ہے، جس میں رشوت ستانی، اقربا پروری تعصب، بے راہ روی، جھوٹ فریب دھوکا جیسی قبیح صفات عنقا ہوتی ہیں۔ اس کی صحت مثالی ہوتی ہے۔ وہ آستین کا سانپ نہیں ہوتا، اس پر انسانیت ناز کرتی ہے۔

تندرستی اور صحت جس چیز میں ہو اس کو منفرد کر دیتی ہے، اس کے حسن کو نکھار کر دیتی ہے، اس کی زندگی میں راحتیں اور مسرت آتی ہیں، کائنات کی جملہ رنگینیاں، ہم قسم رعنائیاں صحت اور

تندرستی کی بدولت ہیں۔تندرست انسان جہانِ رنگ و بو سے مستفید ہوسکتا ہے۔غالب نے سچ کہا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔

تنگدستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

☆☆☆☆☆☆☆

پاکستان میری جنت

جنت کے معنی باغ بھی ہیں، بہشت کے لیے بھی جنت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جنت کا تصور جب ذہن کے دریچوں پر دستک دیتا ہے تو قلب و اذہان میں اس صحت افزا تخیل کے باعث نئے نئے شگوفے کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔اور اس وقت جسم و جان میں پیدا ہونے والی تازگی وطراوت روح تک سرایت کر جاتی ہے۔جس کو جس سے جتنا عشق ہوگا وہ اس کو اپنی جنت اور اپنی بہشت قرار دے گا۔کسی کی جنت اس کا گھر ہوگا، کسی کی جنت اس کا در ہوگا، کسی کی جنت اولاد ہوگی، کسی کی جنت امّ اولاد ہوگی، کسی کی جنت اس کا مکان ہوگا، کسی کی جنت اس کا سلطان ہوگا۔سب کی جنت ان کے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ہے لیکن میری جنت میرا پاکستان ہے کیونکہ یہ ہے تو سب جنتیں ہیں۔اگر یہ نہیں ہے تو پھر جنت بھی جہنم کا عذاب ہے کیونکہ اسی کے دم قدم سے حقیقی جنت کی بہاریں ہیں۔

ہمت ہے تو پیدا کر فردوس بریں اپنا
مانگی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

وطن اس مقدس سرزمین کا نام ہے جس کی آغوش میں انسان جنم لیتا ہے جس کی ہوائیں اسے پروان چڑھاتی ہیں جس کی فضاؤں میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے جس کی مٹی سے اس کا خمیر اٹھتا ہے۔اور اسی کے ذرّے ذرّے سے انسان کی عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔اس کی فضاؤں میں محبت کی خنکی ہوتی ہے، اس کے کھیتوں میں آنکھوں کا نور ہوتا ہے، اس کے گلستانوں میں

چاہت کی چاشنی ہوتی ہے، اس کے ویرانوں میں یگانگت کی اپنائیت ہوتی ہے۔ اس کی ہر چیز جنت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

پاکستان کے در و دیوار، اس کے شجر و حجر، اس کے کوہ و دمن، اس کے گل و گلزار میرے نزدیک جنت نظیر ہیں۔ یہ جیسے بھی ہیں میرے اپنے ہیں، اور پھر ان کے حصول کے لیے میرے آباؤ اجداد نے قربانیاں دی ہیں، کئی بچے یتیم ہوئے ہیں، کئی بیٹیوں کی عزتیں تار تار ہوئی ہیں، کئی عورتیں بیوہ ہوئیں، یہی ملک یہی وطن اس بھری دنیا میں میری پہچان ہے میری شناخت ہے، یہ میری آن ہے، یہ میری جان ہے۔

آج ہم میں سے جو کوئی بھی کسی مقام و مرتبہ پر فائز ہے تو اس ملک پاکستان کی بدولت ہے۔ اس مملکت خداداد نے ہمیں بے پایاں انعامات سے نوازا ہے۔ ہم دیکھیں کہ ہم نے اپنے وطن کو کیا دیا ہے، اور کیا دے رہے ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے جنت نما وطن سے محبت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے ذاتی مفادات کو پسِ پشت ڈال کو ملکی اور قومی مفاد کو پیش نظر رکھیں۔ دنیا کے ملکوں کی صف میں اس مملکت کو اس جنت ارضی کو ممتاز اور بلند مقام دلانے کے لیے کمر بستہ ہوں۔ آج ہمیں ہر قسم کے علاقائی تعصب، صوبائی تعصب، لسانی جھگڑوں اور فرقہ واریت کے عفریت سے اپنی جان چھڑا کر دل و جان سے اس ملک کی چاکری میں لگ جانا ہے۔

یہ ملک ''ملک پاکستان'' اس دنیا میں ہماری جنت ہے، یہ ہمارا مادرِ وطن ہے۔ ہم سب اس کی آغوش میں محفوظ و مامون ہیں اور جو عناصر اس وطن عزیز کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی مذموم کارروائیوں میں مصروف عمل ہیں اور آئے دن دہشت گردی کے واقعات اور بم دھماکے کروا رہے ہیں۔ ہمیں ان شر پسند عناصر کو پہچاننا چاہیے اور ان کے مذموم عزائم کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

جو بھی آئے گا رستے میں کٹ جائے گا
نوکِ خنجر ہے ہر اِک جواں دوستو

پاکستان میری جنت ہے۔ آج میری اس جنت کو ہماری محبت کی، ہماری قربانیوں کی، ہمارے تعاون کی، ہماری توجہ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ

ضرورت جس بات کی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی لغزشوں کا اعتراف کریں۔اس کے در و دیوار، شجر و حجر، ندی نالوں، صحراؤں، ریگستانوں، سمندروں یہاں تک کہ اس کے ذرّے ذرّے سے پیار کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ وہ چمنستان وطن کے ہر گل سرسبز کو پھلا پھولا رکھے۔اور اس پر ہمیشہ بہار رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خود داری حیات نے جُھکنے دیا نہ سر
حسرت سے اُن کا نقشِ قدم دیکھتے رہے

یہ کائنات جو رنگارنگ مظاہر فطرت سے بھری پڑی ہے، اس میں ہمیں فلک بوس پہاڑ نظر آرہے ہیں، کہیں کشتِ زعفران بنے کھلیان وکھیت نظر آرہے ہیں، کہیں پیچ وبل کھاتی ہوئی ندیاں اور نہریں نظر آرہی ہیں۔ پہاڑوں سے میٹھے اور ٹھنڈے چشمے نکل کر اس کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں ہر ذی روح کے لیے اس کا رزق مقرر ہے جو اس نے متعین مدت تک حاصل کرنا ہے اور پھر داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کرنی ہے۔مقررہ کردہ رزق جس کا تعین اس خالق حقیقی کی طرف سے کر دیا گیا ہے اور جس کا ذمہ اس رازقِ کائنات نے لے رکھا ہے وہ تو ہر صورت میں ملنا ہے۔''زمین پر کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے رزق کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود نہ لے رکھا ہو'' (القرآن)

فضاؤں میں محو پرواز طائرِ خوش الحان بھی اپنا رزق حاصل کر رہا ہے، منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیٹھ کر واعظ شیریں بیان بھی اپنا رزق حاصل کر رہا ہے، ظلماتِ شب میں سیاہ پتھر پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے بھی اپنا رزق حاصل کرتے ہیں، آفتاب کی کرنوں سے خائف چمگادڑ بھی اپنے پیٹ کی آگ بجھا کر سوتی ہے۔شاہین پرواز کی بلندیوں پر اپنا رزق حاصل کرتا ہے اور گدھ مردار کے پاس بیٹھ کر اپنا رزق حاصل کرتا ہے، کسان ہل چلا کر، پانی لگا کر اور رات سانپ کے سروں کو مسل کر اپنا رزق حاصل کرتا ہے اور راہزن لوٹ مار اور غارتگری سے اپنا رزق حاصل کرتا ہے، قاضی کرسی منصب پر بیٹھ کر اپنا رزق حاصل کرتا ہے اور مجاہد

سرحدوں کی حفاظت کر کے اپنا رزق حاصل کرتا ہے۔ دولت مند انسان اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر کے رزق حاصل کرتا ہے اور گداگر گلیوں، چوراہوں، اور پارکوں میں بھیک مانگ کر اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ الغرض ہر ایک رات کو پیٹ بھر کر سوتا ہے۔

احسان ناخدا کا اُٹھائے مِری بلا
ساحل کو چھوڑ دُوں میں کہ لنگر کو توڑ دُوں

قرآنِ پاک میں فرمانِ خداوندی ہے کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ نباضِ قوم حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قوم کو اپنے اس شعر میں حقیقی رزق کے تلاش کرنے کے لیے ترغیب دینے کی مساعی جمیلہ کی ہیں۔ اور اس کے نزدیک حقیقی رزق وہ ہے جو انسان کو ذلت کی پستیوں سے نکال کر عزت و حرمت کی رفعتوں اور بلندیوں پر لے جائے۔ وہ ایسے رزق کا خواہاں اور متمنی ہے جس سے پیدا ہونے والا صالح خون انسان کی عروق مردہ کو حیات بخشے اور اس کے قوائے مضمحل کو امور صالحہ کی انجام دہی کے لیے مستعد کرے، رزق وہی اچھا ہوتا ہے جس کے استعمال سے ایک طالب علم با مقصد تعلیم کے حصول کے لیے کوشاں رہے اور ایک مسیحا صاحب فراش لوگوں اور بیماری سے تڑپتی ہوئی انسانیت کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہے، رزق وہی اعلیٰ وارفع ہے جو بھائی کی نظروں میں اگر حیا پیدا کرلے تو ان میں عفت و پاکیزگی جیسی صفات بھی پیدا ہوں، جو لوہار کے ہاتھوں میں سختی پیدا کرے تو سونار کے ہاتھوں میں نرمی کے ساتھ ساتھ نیت اور ارادوں میں فتور بھی پیدا کرنے کا باعث نہ ہو، رزق کے حصول میں مساعی جمیلہ کی جائیں، تگ و دو کی جائے، جہد مسلسل کی جائے تو ملنے والا رزق صفات محمودہ کی تخلیق کا باعث ہوگا۔ رشوت کی صورت میں، کرپشن کی صورت میں، لوٹ مار کی صورت میں، غارتگری کی صورت میں، راہزنی اور چوری کی صورت میں حاصل کیا جانے والا رزق جہاں معاشرے کے لیے کلنک کا ٹیکہ ثابت ہو گا وہاں وہ ننگِ انسانیت بھی ثابت ہوگا، ایسے رزق کو بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ایسے رزق کے حصول کے لیے تگ و دو اور کاوش کرنے سے تو مر جانا بہتر ہے۔ ''اور اس سے تو موت کو گلے لگانے میں ہی عافیت ہے۔

اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کرے، وہ رفعتوں اور بلندیوں پر پہنچے۔ اگر وکیل ہے تو وہ عدالت میں کرسی عدل وانصاف پر بیٹھنے کا متمنی ہے، اگر تاجر ہے تو وہ تھوڑے وقت میں اپنے علاقے کا نامور صنعتکار اور تاجر بننے کی آرزو اپنے قلب میں لیے منتظر بیٹھا ہے، اور اگر وہ واعظ ہے تو وہ اس بات کا آرزومند ہے کہ لوگ اس کو ہمہ تن گوش ہو کر سنیں اور اس کی نصائح پر عمل پیرا ہوں، ان سب چیزوں کا حصول امکان سے باہر نہیں ہے۔ یہ حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن ان سب کے لیے صفات قبیحہ یعنی حسد، غیبت، نفرت، بغض، جھوٹ، عصبیت، اقربا پرور کی چادر کو تار تار کرنا پڑے گا اور صفات محمودہ یعنی صدق وسچائی، مروّت، اخوت، ہمدردی اور محبت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا ہوگا اور ان سب کا حصول اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت میں مضمر ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کے لیے رزق کا حلال ہونا انتہائی ناگزیر ہے، اس سے یہ بات مشروع بھی ہے اور زبان زد عام بھی کہ رزق حلال عین عبادت ہے، جو رزق حلال عین عبادت ہے، جو رزق دینی اور دنیاوی اعتبار سے نقصان دے اور کوتاہی پرواز کا باعث بنے اس سے تو اس فانی زندگی کو خیر آباد کہ کر اصلی اور حقیقی زندگی کو گلے لگانا باعث مسرت بھی ہے نوید جان فزا بھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

علامہ اقبال کی طلبا سے توقعات

طالب علم کو ہر شخص بنظر استحسان دیکھتا ہے اپنی پہلی نظر میں جو تصور اُس کے ذہن میں آتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ملک وقوم کی خدمت کرے گا، ماں باپ کی فرمانبرداری کرے گا، ہر ایک کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آئے گا۔ اور وُہ طالب علم بھی بڑا خوش نصیب ہے جو اپنے بزرگوں کی توقعات پر پورا اترتا ہے۔

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جو حکیم الامت بھی ہیں پوری دنیا ان کی عظمت کو سلام کرتی ہے ان کے اشعار جو دیوان کی صورت میں موجود ہیں، اخلاق حسنہ پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ اپنے ان اشعار کے ذریعے خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

طلباء کے بارے میں جو نظریات، خیالات، تصورات، دیگر سلف صالحین کے ہیں ان سے ملتے جلتے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات اور توقعات ہیں۔ طلباء کے اندر وُہ چیز جو ان کی شخصیت کو نکھارنے کے لیے اہم رول ادا کرتی ہے مطالعہ ہے، مطالعہ کا عادی طالب علم اپنے ہم مکتب ساتھیوں میں، اپنے ہم عمر دوستوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، کمرۂ جماعت میں وہ مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے، کیونکہ جو اسباق اس نے پڑھنے ہوتے ہیں وہ اس کی نظر سے پہلے گزر چکے ہوتے ہیں اور ان کی تشریحات سے پہلے ہی اس کی آشنائی ہوتی ہے۔

دوسری اہم خصوصیت جو طالبعلم کے لیے انتہائی ناگزیر ہے وہ صفائی ہے اور صفائی تو ویسے ہی ایمان کا حصہ ہے، صفائی اور پاکیزگی کی موجودگی طالب علم میں فہم وفراست کے اضافہ کا سبب بنتی ہے نفیس طبع طالب علم دیگر طلباء کی نسبت مستعد اور چاک وچوبند رہے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں منفرد ہوتی ہیں ان کے انداز جداگانہ ہوتے ہیں۔ ان کی صحت مثالی ہوتی ہے، ان کی دماغی صحت کے اساتذہ بھی

معترف ہوتے ہیں۔اچھا طالب علم "العقل السلیم فی الجسم السلیم" کے مصداق زندگی گزارتا ہے۔

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ایک عظیم مفکر، عظیم ہستی ، اور آسمانِ علم و دانش کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ وہ ایک طالب علم میں ایسی صلاحیتوں کے متمنی ہیں جو اس کو ہر میدان میں کامیابی سے ہمکنار کریں۔ وہ طالب علم کو روایتی طالب علم نہیں دیکھنا چاہتے کہ ایک چھوٹا سا لڑکا کمر پر کتابوں کا بوجھ لادے لکیر کا فقیر بنے ہوئے دوسرے طالبعلموں کے پیچھے چلا آرہا ہے اور چھٹی کے وقت کتابیں اُٹھائے گھر واپس چلا گیا، کتابیں رکھیں اور فارغ ہوگیا گویا اس نے اپنا کام پورا کرلیا۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایسے طالب علم کے متمنی ہیں کہ جو اپنی کتاب میں پڑھے "والدین کا احترام کریں" تو جب وہ واپس آئے تو جو کچھ اس نے پڑھا ہے اس کا عملی مظاہرہ کرے اور والدین کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے، اگر وہ تواضع کا باب پڑھے تو مجسمہ عجز وانکسار بن جائے، اگر غرور وتکبر ونحوست کی سطور اس کی نظر سے گزریں، تو فخر کر کے لباس فاخرہ کو اتار پھینکے، اگر وہ عبادت وریاضت کے باب کا مطالعہ کرے تو شب بیدار اور تہجد گزار بن جائے۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فخر وغرور کی غلاظت سے اٹھنے والی عفونت سے تو ضرور روگردانی کرے لیکن عزت نفس اور خودداری کے تاج کو اپنے سر پر لازم سجائے، عزتِ نفس اور خودداری کا محافظ طالب علم انفرادی حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ طلبا سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ابتدائی ایّام میں سیاست سے دور رہیں کیونکہ یہ اوقات بڑے قیمتی ہوتے ہیں اگر انہوں نے سیاسی میدان میں ابتداء ہی سے قدم رکھنا شروع کردیا تو ان کی عقل، سوچ، ناپختہ رہ جائے گی اور ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ خام خیالی ثابت ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کام انہوں نے کرنا ہے، سیاست کرنی ہے، اسمبلیوں میں آنا ہے، قانون بنانے والوں کے ساتھ ہم نشینی کرنی ہے، انتظامیہ ان کی معاونت کی منتظر ہے لیکن یہ سب کچھ اپنے وقت پر ہوگا فی الحال ان کو اپنی بنیاد کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے اور ساری توانائیاں تعلیم کے لئے مختص کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ طلباء سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں وہ مسلمان ہیں، مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، ان کا قیام وقعود، نشست وبرخاست، خوردونوش اسلامی ہونی چاہیے وہ

ہمہ وقت اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر عمل پیرا ہونے کے لیے کمر بستہ ہوں، ان کی رگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت رچی بسی ہونی چاہیے اور مستقبل میں خدمتِ اسلام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو، اور ہمہ وقت اسی کے لیے کوشاں رہیں۔

بارے دنیا میں رہو شاد کہ نا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

☆☆☆☆☆☆☆

آمریت سے ہی پاکستان کا مستقبل ہے

وفوق کل ذی علم علیم کے مصداق ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے، ہر ایک کا قلب و دماغ مختلف ہے۔ جسمانی اختلاف کے ساتھ ساتھ زمینی حقائق دیگر بوقلمونیوں کے بھی معترف ہیں، ہر ایک اپنے اپنے انداز میں گفتگو کا، تحریر کا، تقریر کا ملکہ رکھتا ہے۔ کوئی ذی روح مخلوق صرف اشاروں کنایوں سے ہی اپنی منزل کا تعین کر لیتی ہے اور کسی طبقے کو زجر و توبیخ کی بدرجہ اتم ضرورت ہوتی ہے۔

جن نابغۂ روزگار ہستیوں اور نفوس قدسیوں کے دل و دماغ حصول منزل کے لیے مضطرب رہتے ہیں۔ وہ شاہراہِ حیات سے خارداروں اور خس و خاشاک کو نظر انداز کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اپنے مستقبل کی تابندگی انہیں ہر لحاظ سے عزیز ہوتی ہے اور وہ اسی کے حصول کے لیے شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔ اور یہی ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔

مستقبل کا حسن ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے لیے حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں، بیماری کے بعد صحت کی قدر میں اضافہ ہو جاتا ہے، نمکین چیز کے استعمال کے بعد معمولی مٹھاس کا ستعمال بھی لبوں کو آبِ زلال کا ذائقہ بہم پہنچاتا ہے، تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے، غربت کے بعد آنیوالی امارت کے استمرار کے مواقع وافر مقدار میں میسر آتے ہیں۔ کانٹوں کے درمیان سے کھلنے والے گل سرخ کی مہک مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے۔

اصل مقصد پاکستان کے استقبال کے گیسوؤں میں مشاطگی ہے، اگر آمر مثبت سوچ کا

حامل ہے تو وہ آمرانہ طرزِ حکومت میں بھی پاکستان کو تحفظ دے سکتا ہے، پاکستان کی معیشت میں ایک مثالی کردار ادا کرسکتا ہے۔ پاکستان کی زراعت کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں خاطر خواہ راہنمائی کرسکتا ہے، پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کے فقدان کو دور کرنے میں مثالی کردار ادا کرسکتا ہے۔

بعض حلقے جمہوری فکر کو پسند کرتے ہیں، یہ ان کی اپنی سوچ ہے۔ آمرانہ طرزِ حکومت میں نظم وضبط کی پابندی کروائی جاتی ہے، فکرِ معاش سے بے فکر لوگ اس طرزِ حکومت کے کارپرداز ہوتے ہیں، اور وہ بغیر کسی دباؤ کے اپنی حکومت کے استحکام میں محو رہتے ہیں۔ ان کی سوچ کسی ایک طبقے کی طرف مرتکز نہیں ہوتی بلکہ وہ مجموعی طور پر ملک میں امن وعافیت کے متمنی رہتے ہیں۔

جمہوریت میں اگر حکومت (عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے) عوام کی ہی ہوتی ہے لیکن اس میں وہ لوگ برسرِ اقتدار آجاتے ہیں جن کو منتخب کرنے والے ان کے مزارع اور ملازم ہوتے ہیں، جو ذہنی پستی کا مسلسل شکار رہتے ہیں اور احساسِ کمتری کے درخت کے نیچے ان کا قیلولہ ہوتا ہے۔ ان کے حق رائے دہی سے ایوان میں پہنچنے والے لوگ معاشرے کے لیے قابل قدر خدمات دینے سے قاصر رہتے ہیں۔

عوامی جذبہ خیر سگالی سے معمور ایک شخص جب تمام رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے ایوان میں پہنچتا ہے تو اس کا مطمع نظر ذاتی غرض وغایت نہیں ہوتی، اچھے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والا، اچھی اور معیاری خوراک کا استعمال کرنے والا، عوام کے لئے فلاح وکامرانی کے جذبات رکھنے والا آمر، گھسی پٹی جمہوریت کا نام لے کر ایوان اقتدار تک پہنچنے والے غیر جمہوری رویوں کے حامل جمہوری افراد سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔

آمریت، جمہوریت کی متضاد ہے لیکن مقصود صرف اور صرف استقبالِ پاکستان کی تابندگی ہے، آمریت پسند عناصر اگر مخلص اور صاحب علم ہوں تو وہ ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، ان کی سوچ، ان کی سختی، ان کی طرز قلبی، ان کے زجر وتوبیخ سب کی سب پاکستان اور ملک کے لیے ہوتی ہے۔ آمرانہ سوچ کے سیلاب کا رخ اگر صحیح سمت ہو جائے تو کھیت وکھلیان میں بہار آجاتی ہے اور گلستانِ ہستی میں خودرو پودوں کی بجائے شجر سایہ دار کی روئیدگی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ نظریہ آمریت کے حامی افراد کے نزدیک آمریت ہی پاکستان کا مستقبل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

جمہوریت سے ہی پاکستان کا مستقبل ہے

ہر کس و ناکس کی پیہم جد و جہد اس کے مستقبل کے نکھار کے لیے ہوتی ہے۔ گذشتہ راصلوۃ آئندہ را احتیاط کے پیشِ نظر ماضی کو کریدنا اہلِ لب کا شیوہ نہیں ہوتا صرف واقعات سابقہ سے حصول عبرت منشاء و مراد ہوتی ہے۔ حال کو بحسن و خوبی گزارنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی درخشندگی و تابندگی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ جو پھر گیسوئے گیتی ءِ استقبال میں مشاطگی کا فن سیکھ لیتا ہے۔ نابغۂ روزگار گردانا جاتا ہے۔

کوئی اپنا مستقبل سنوارتا ہے، کسی کی آواز یہ انگڑائیاں لیتی ہے کہ افراد خانہ کا مستقبل روشن ہو جائے، کسی کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ میری قوم کا مستقبل مستنیر و منور ہو جائے، کسی کے دل و دماغ کے کونے کھدرے میں یہ بات مہیمز ثابت ہونا شروع ہوتی ہے کہ روشن مستقبل ہی حاصل حیات ہے اور وہ اسی میں اپنی حیاتِ مستعار کے عظیم لمحات صرف کر دیتا ہے۔

کتنا خوش نصیب ہے وہ شخص جو انفرادی کے بجائے اجتماعی سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ اور پورے ملک کے لیے اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ درخشندہ و تابندہ مستقبل کی فضاء میں سانس لے۔ پاکستان کے مستقبل کی یہ خواہش صرف اور صرف جمہوری طرزِ عمل سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں بسنے والے ہر شخص کی عزت و احترام صرف اور صرف جمہوریت سے ہی وابستہ ہے۔

جمہوریت میں ہر شخص کو گفتگو کی، تحریر کی، تقریر کی آزادی ہوتی ہے، وہ قانون کے دائرے میں رہ کر اپنی آواز ایوانوں تک پہنچا سکتا ہے، اور اُس کی حق و صداقت پر مبنی آواز سے

ایوان بالا کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں، ایوانوں میں موجود عوامی نمائندگان کی سوچ فلاح انسانیت کے کاموں کی تکمیل کے لیے مستعد و متحرّک ہو جاتی ہے۔

جمہوریت چونکہ عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے ہوتی ہے اس طرزِ حکومت میں عوامی فلاح کو مدنظر رکھا جاتا ہے عوام کی معاشی بہتری پیش نظر ہوتی ہے عوام کی تعلیمی کمی اور فقدان کو دور کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کیجاتی ہے، عوام کی معاشی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی بہتری کے پھول صرف گلستان جمہوریت ہی میں کھلتے ہیں۔

اس کے علی الرغم اور برعکس آمریت کا نظام ہے، اس طرز حکومت میں خوشحالی صرف چند خاندانوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ آمرانہ طرز حکومت میں غریب اور مظلوم کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، فاقہ کش لوگ کسمپرسی کے عالم میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں، عام لوگوں کو ایوان بالا تک رسائی نہیں ہوتی، آمریت اور ملوکیت میں غرباء و مساکین اور یتامیٰ کا استحصال ہوتا ہے۔

ملوکیت اور آمریت کے شجر خاردار کے نیچے اگنے والا پودا بھی ثمر بار نہیں ہو سکتا۔ اس کی گھنی چھاؤں کبھی تھکے ماندے مسافر کے لیے سائے کی صورت میں سامانِ راحت بہم نہیں پہنچا سکتیں۔ آمریت کے پروردہ شخص کی سوچ غریب اور مفلوک الحال و صاحب فراش لوگوں کے لیے مسیحائی کا کام نہیں دے سکتی۔ آمرانہ طرز حکومت کے گلستان میں خس و خاشاک کی فراوانی ہوتی ہے۔

جمہوریت اور جمہوری اقدار سے مرصّع طرز حکومت، فرد کے لیے، خاندان کے لیے، معاشرے کے لیے، قوم کے لیے اور ریاست و ملک کے لیے نعمت غیر لازوال سے کم نہیں ہے۔ ملک جمہوریت کی بلندیوں میں محو پرواز انسان کی سوچ اور آسمان آمریت میں بلند پروازی کے متمنی شخص کی فکر میں تفاوت نمایاں ہوتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک پاکستان کا دیگر ممالک میں ایک نام ہو، ترقی یافتہ ممالک کی صفوں میں شامل ہو، اس کے گلستان میں بہار آئے، اس کے کھیت و کھلیان کشتِ زعفران کا نمونہ پیش کریں، اس کے مسیحا، اس کے قانون دان، اس کے صنعت کار، اس کے سیاستدان انفرادی حیثیت کے حامل ہوں تو پھر ہمیں جمہوریت کی خلعتِ فاخرہ کو زیب تن کرنا ہوگا کیونکہ اسی میں ہی ہمارے ملک پاکستان کے مستقبل کی درخشندگی و تابندگی وابستہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

خود روزگاری کیوں اور کیسے؟

زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، زندہ رہنے کے لیے انسان کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی اس کی صغرسنی ہوتی ہے، کبھی عالم شباب ہوتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پیرانہ سالی کا شکار ہو کر داعی اجل کو لبیک کہہ دیتا ہے۔ ان ادوارِ حیات میں زندگی کی بوقلمونیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس کے دسترخوان پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوتے ہیں اور کبھی ایسی بھی گھڑی آتی ہے کی کئی کئی دن معدودے چند لقموں کے علاوہ دسترخوان پر کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہوتی۔ لیکن ذی شعور انسان کبھی پستی کا شکار نہیں ہوتا۔ ہمہ وقت کدو کاوش کرتا رہتا ہے۔ اور یوں اس کے ایّام زیست کروٹیں بدلتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

انسان کی یہ بات فطرت میں شامل ہے کی وہ اچھے سے اچھے اور بہتر سے بہتر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ملک میں اگر روزگار کے مواقع حکومت عوام الناس کے لیے فراہم نہ کر سکے تو بے روزگاری کے منحوس سائے افق پر منڈلانا شروع ہو جائیں، ہر سو غربت ہی غربت دکھائی دے، قوم کی کثیر تعداد غربت وافلاس کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے اور کوئی پرسان حال نہ ہو اور کسمپرسی کا شکار لوگ اپنی زندگی کے ہاتھوں پریشان ہوں تو پھر بھی ذی فہم وفراست شخص خود روزگاری کے ذریعے اپنے آپ کو اور اپنے معاشرے کے افراد کو غربت و افلاس کی دلدل سے نکالنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

حدیث نبوی ہے ''الکاسب حبیب اللہ'' حلال روزی کمانے والا اللہ تعالیٰ کا دوست ہوتا ہے۔ اس طرح جو شخص بھی مسلمان ہونے کے ناطے کاروبار سے دلچسپی رکھتا ہے، اپنے اہل

خانہ کے لیے دن بھر محنت کرتا ہے، ایک تو وہ اپنی اُخروی زندگی میں سرخروئی حاصل کرتا ہے اور مزید برآں اپنے بچوں، والدین اور شریکِ حیات کے چہرے پر مسرت وشادمانی دیکھ کر اپنی روح کی طراوت کا بھی انتظام کرتا ہے۔ خودروزگاری اس لیے بھی ضروری ہے کہ کسی دوسرے پر انحصار کی عادت ختم ہوجائے، کسی کے سہارے زندہ رہنے کا جذبہ سرد پڑ جائے۔ اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنے کی عادت پختہ ہوجائے۔ خودروزگاری کی ضرورت اس وقت بہت محسوس ہوتی ہے جب حکومت وقت روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں ناکام ہوجائے، صنعتیں اور کارخانے بند ہوجائیں، فیکٹریوں اور کارخانوں کو چلانے کے لیے برقی طاقت کم پڑ جائے، آبادی میں اضافے کے سبب عوام الناس کا سیلاب ایام بلوغت کے لمحات شاہراہوں پر مارا مارا گزار رہا ہو۔

گھر کا سربراہ جب تساہل اور غفلت کا شکار ہو، ہاتھ پر ہاتھ دھرے من وسلویٰ کے انتظار میں بیٹھا رہے اور اس کے اہل خانہ چتھیڑوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں، اس کے چولہے سرد ہوچکے ہوں، اس کے گھر کے آنگن میں غربت وافلاس کے خس وخاشاک خودرو پودوں کی صورت میں نمودار ہوچکے ہوں۔ جس کی دولت وثروت کا سورج غروب ہوچکا ہو۔ جس کے نونہال نانِ جویں کو ترس رہے ہوں۔ جس کا پورا کنبہ حسرت ویاس کی تصویر بن چکا ہو، اس وقت اس کو صحیح جانب راہنمائی کرنے میں کوئی غیر مرئی قوت فعال کردار ادا کرے اور اس کی فکر کو صحیح راستہ فراہم کرے اور اس کو یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی بجائے کچھ کرنا بہتر ہے تو اس کے لیے مہیمز کی نعمت مُستمرہ سے کم نہ ہوگی۔

خودروزگاری کی ابتداء اپنے گھر ٹسے کی جاسکتی ہے، سمال انڈسٹریز کے ذریعے اپنے کاروبار کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ وہ کام جو ابتدائی طور پر گھر سے شروع کیے جاسکتے ہوں ان کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ صاحب ثروت حضرات سے قرضِ حسنہ لے کر اپنے کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں ڈال کر کسی مختصر سے کام کا آغاز کیا جاسکتا ہے، اگر یہی جذبہ ہمارے درمیان پیدا ہوجائے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلما پنے چھوٹے چھوٹے کام خود سرانجام دے لیا کرتے تھے اس لیے ہمیں بھی محنت سے جی نہیں چرانا چاہیے۔ صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سنت پر عمل پیرا ہونے سے ہی ہماری کسی کا دست نگر رہنے کی عادت ختم ہوسکتی ہے۔ بھینس پالنا، بھیڑ بکریاں پالنا، قالین بافی، دودھ دہی کا کام، چھوٹے

پیمانے پر کاشتکاری، گھریلو سطح پر تعلیم و تدریس کا انتظام، سلائی کڑھائی کا کام ہی ایسے کام ہیں جو مختصر سے سرمایہ سے شروع کیے جاسکتے ہیں اور اس طرح خود روزگاری کا سلسلہ بے روزگاری کے خاتمے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس طرف توجہ دی جائے۔

خود روزگاری ہمّت بڑھاتی ہے
فاقہ کش کو سپنے دکھاتی ہے

آزادی ایک نعمت عظیم ہے

صبحِ آزادی کا سورج جسم و جاں پہ قرض ہے
اس کی کرنوں کی حفاظت اب تمھارا فرض ہے

آزادی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کا شکر ادا کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ شکر در اصل نعمت کی فراوانی کا سبب ہوا کرتا ہے اور کفرانِ نعمت زوال کا باعث بنتا ہے۔ شاکرین کے در پر نعمتیں مسلسل دستک دیتی رہتی ہیں۔

آج ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر جھانکیں کہ ہم نے آزادی کی نعمت کا کس حد تک شکر ادا کیا ہے اور خدا اور مخلوقِ خدا سے جو وعدے کیے تھے انہیں کہاں تک پورا کیا ہے؟

ہم نے نعرہ لگایا تھا کہ ''ہم پاکستان میں قرآن کا قانون جاری کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی روشنی میں زندگی کا سفر طے کریں گے۔ نیکی کا علَم بلند کریں گے اور بدی کو سرنگوں کر کے چھوڑیں گے، گناہوں کی اندھیری رات میں نیکی کے دیئے جلائیں گے اور شبِ تیرہ کی تیرگی کا جنازہ نکال کر دم لیں گے۔ جبر و استبداد کی کالی گھٹائیں چھٹ جائیں گی۔ عدل و انصاف کا قاضی محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کر دے گا۔ غربت کے مہیب سائے رخصت ہو جائیں گے۔ تنگدستی اور محتاجی کے عفریت کو منہ کی کھانی پڑے گی۔ خوشحالی کا آفتاب طلوع ہوگا اور افلاس زدہ انسان امن و عافیت کے گہوارے میں خوشی کے نغمے گاتے ہوئے زندگی بسر کریں گے۔

یہ تھے وہ مقاصد جن کے حصول کے لیے برصغیر کے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے

نا قابلِ فراموش قربانیاں دیں۔اسی ارض پاک کے لیے ہمیں آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا۔ یہ پاکستان نہ تو حسینوں کی اداؤں سے بنا اور نہ ہی یہ مغنّیہ کی صداؤں سے بنا اور نہ ہی رقص وتبسم کا کرشمہ ہے۔ یہ نہ حنا آلود ہاتھوں کی مہک سے اور نہ ہی مشاطگی کے اندازِ ساحرانہ سے وجود میں آیا۔اس کی نقش گری نہ تو شبِ زفاف کی رنگ رلیوں میں ہوئی اور نہ ہی حجلۂ عروسی کی رعنائیوں میں، لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں اس کی نذر ہوئیں، جوانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، دخترانِ اسلام کے سہاگ اُجڑے، غیرت مند باپ اور غیور بھائیوں کے سامنے ان کی عصمتوں کو تار تار کیا گیا۔اور کتنی ہی بے گوروکفن لاشیں گنگا جمنا کے آبِ رواں پر تیرتی رہیں۔(ماخوز)

مگر افسوس کہ آج ہم نے آزادی کا مفہوم ہی بدل ڈالا۔آزادی کا مقصد جو ہم نے سمجھ رکھا ہے وہ یہی ہے کہ ہم لوگ مادرِ پدر آزاد ہو گئے،عدل وانصاف سے آزاد ہو گئے، زہد وتقویٰ سے آزاد ہو گئے، امانت ودیانت سے آزاد ہو گئے،حق وصداقت سے آزاد ہو گئے،شریعت و طریقت سے آزاد ہو گئے،شرافت ولیاقت سے آزاد ہو گئے،فرمانبرداری والدین سے آزاد ہو گئے،عظمتِ کبائر اور شفقتِ صغائر سے آزاد ہو گئے،فلاح و بہبود کے کاموں سے آزاد ہو گئے، یہ بات ہرگز نہیں ہے آزادی کا مقصد یہ تھا کہ ہم انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے آزاد ہوں نہ کہ ہر قسم کی نیکی،احسان، بھلائی واچھائی کو خیر آباد کہہ دیں۔

آج ہمارا حال عجب ہو چکا ہے ہماری زندگی کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی بلکہ تمام پہلو چوپٹ ہو چکے ہیں۔ایک بے ترتیبی اور انارکی ہے جو چہار سو پھیلی ہوئی ہے اور یوں لگتا ہے کہ ہمارا شعور، ہمارا احساس اپنی موت آپ مر چکا ہے اور جب قوموں کے ذہن مردہ ہو جائیں اور احساس باقی نہ رہے تو قوم کی ذہنی پستی اسے اغیار کی دہلیز پر جھکنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے اور جب قومیں خانۂ اغیار کا طواف کرنے لگتی ہیں تو آبا واجداد کی میراث گم ہو جایا کرتی ہے۔

آزادی ایک انمول نعمت ہے ہماری کامیابی اور کامرانی کی راہیں تب کھلیں گی جب ہم اس کی حقیقی روح تک پہنچیں گے، جب ہم اس کی قدر کرنا سیکھیں گے،آزادی کی قدر پوچھنی ہے تو اس طائر سے پوچھیں جو قفس میں بند ہے اور محو پرواز طیّور کے چہچہانے کی آوازیں اسے

ماہی بے آب کی طرح تڑپا رہی ہیں۔ غلامی کی آب و ہوا سے پیدا ہونے والا خون کبھی مردہ رگوں میں جان پیدا نہیں کرسکتا۔ غلامی کے ایندھن سے جلنے والا چولہا بھی مقوی غذائیں تیار نہیں کرسکتا۔ غلامی کی فضاء میں لیا جانے والا سانس کبھی پھیپھڑوں کی حرکات میں توازن پیدا نہیں کرسکتا۔ غلامی کی سرزمین پر اُگنے والا پھول کبھی فضائے چمن کو معطر نہیں کرسکتا۔ پھر ہم کیوں نہ کہیں کہ آزادی ایک انمول نعمت ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یہ قانونِ قدرت ہے کہ جس نعمت کی جتنی قدر کی جائے صرف اس میں استحکام پیدا ہوتا ہے بلکہ "لئن شکرتم لازیدنکم" کے مصداق اس امت میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔ آج ہمیں اس آزادی کے تحفظ اور تعمیر و ترقی کے لیے ایک ہمہ گیر ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ ذہنی مرعوبیت، جاہلانہ طرز فکر، ذہنی جمود، اخلاقی پستی، مادی نقطہ نظر، آرام طلبی، مغرب کی نقالی، مشرکانہ رسوم، غیر اسلامی معاشرت، اسراف و تبذیر، نمود و نمائش اور اس طرح کی دیگر خرابیوں کا تدارک کے بغیر ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا، گلستانِ آزادی میں محبت و مودت، عدل و انصاف، اخوت و مروت، حق و صداقت، باہمی ہمدردی، غریب پروری، ایثار و قربانی کے گلہائے رنگارنگ کی پررونق فضاء کو برقرار رکھنے کے لیے رشوت خوری، سمگلنگ، چور بازاری، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، دھوکہ دہی، فریب کاری، ڈاکہ زنی، دروغ گوئی جیسے نوکدار کانٹوں اور خس و خاشاک کو جڑ سے اکھیڑنا ہوگا، ہمیں آزادی کے استحکام کی راہ میں ہر رکاوٹ کو دور کرنا ہوگا آزادی ایک انمول نعمت ہے کا صرف میں ہی نہیں بلکہ ہر ذی شعور، ذی فہم و فراست، کوتاہ قد، طویل القامت، لحیم شحیم اسود و احمر، پہاڑوں کا باسی، غاروں کا باسی، صحراؤں کا باسی، فضاء میں محو پرواز طائران خوشنوا سب کے سب قائل ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری ہر سانس آزاد وطن میں اپنا تسلسل برقرار رکھے اور جب دم واپسیں ہو تو آخری سانس بھی آزادی کی نذر ہو۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆

آدمی ہیں بے شمار مگر انسان کوئی نہیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس کائنات میں رنگینیاں ہی رنگینیاں ہیں، کہیں صحراء ہیں کہیں دریا ہیں، کہیں شجر ہیں تو کہیں حجر ہیں، کہیں ندی نالے ہیں جو موتیوں کی طرح چمکنے والے پانی کو کھیتوں کھلیانوں میں پہچانے کے لیے رواں دواں ہیں، کہیں فلک بوس پہاڑ ہیں جو سیاحوں کی نظر اپنی جانب مبذول کروا رہے ہیں۔ فلک پر کواکب اپنی سج دھج دینے سے موجود ہیں، ماہتاب و آفتاب مفوضہ فریضہ سرانجام دینے کے لیے پرعزم ہیں۔

جملہ مخلوقات اپنی اپنی جگہ پر انتہائی اہمیت کی حامل ہے لیکن ''احسن تقویم'' اور اشرف المخلوقات کا تاج اللہ تعالیٰ نے انسان کے سر سجایا ہے، شرف انسانی کی خلعت فاخرہ انسان ہی نے زیب تن کی ہے۔ میدان شرف و بزرگی کا شاہسوار انسان ہی کو بنایا ہے، آسمانِ رفعت کا آفتاب و ماہتاب انسان ہی ہے۔ انسان جب انسانیت کی خصوصیات سے مزیّن و مرصعّ ہوتا ہے تو فرشتوں کو اس پر رشک آتا ہے۔ بقول شاعر

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا!
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسان کا مادہ انس ہے، جس کا مفہوم محبت پیار اور خلوص نکلتا ہے، اگر کوئی بظاہر انسان دکھائی دے رہا ہے، اس کے اعضائے جسمانی اس کے انسان ہونے پر دلالت کر رہے ہیں، دیکھنے والی دو آنکھیں، سننے والے دو کان اور بولنے والی زبان یہ سب اعضاء اس کے انسان

ہونے کا پتہ بتا رہے ہیں کہ یہ انسان ہے، لیکن اہل لُب کے نزدیک وہ انسان انسان نہیں جس کی شکل وصورت انسانوں والی ہو بلکہ وہ انسان انسان ہے جس کے کام انسانوں والے ہوں اور جو انسانیت کی معراج پر فائز ہو، صاف ستھرا لباس ہے، قد کاٹھ مناسب ہے، چال ڈھال متوازن ہے، نشست و برخاست معقول نظر آتی ہے، انداز گفتگو درست اور صائب ہے لیکن اندر نفاق ہے، منافقت کا مرقعّ ہے، افراء واقرباء اس سے نالاں ہیں، دوست واحباب کے ساتھ اس کا رویہ معاندانہ ہے۔ گھر میں اس کا معیار کا پیمانہ رو بہ زوال ہے، تو ایسا شخص ایک آدمی تو کہلا سکتا ہے انسان کہلانے کا سزاوار نہیں۔ جو شخص فخر وغرور کو روا گردانتا ہے، رعونت اور فرعونیت اس کی سرشت میں شامل ہیں، بغض وحسد اس کی گھٹی میں موجود ہے، غیبت وچغلی کرنا اس کا معمول ہے، دروغ گوئی اور کذب بیانی اس کی عادات ثانیہ بن چکی ہے، والدین کی نافرمانی، اور بزرگوں کی بے ادبی کو وہ فخریہ پسند کرتا ہوں تو ایسا شخص آدمی تو ہوسکتا ہے انسان نہیں ہوسکتا، عظیم انسان اور نابغۂ روزگار لوگ بھی کبر وغرور کے پاس بھی نہیں پھٹکتے لیکن کچھ خود ساختہ اور ریا کار قسم کے لوگ اپنے آپ کو بڑا تصور کرنے میں شب وروز ایک کر دیتے ہیں۔ اور دیگر سادہ لوح انسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ اصل میں انسان نما حیوان ہوتے ہیں جو بنی نوع انسان کو رنج والم اور دکھ پہنچانے میں ہمیشہ کمر بستہ رہتے ہیں۔

زاہد نگاہِ کم سے کسی رِنْد کو نہ دیکھ
کیا جانے اُس کریم کو تُو ہے کہ وہ پسند

جب اس عالمِ رنگ و بو میں نظر دوڑاتے ہیں، تو آدمیوں کا جمِ غفیر اور سیلاب نظر آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی شعبہ سے وابستہ ہے، شعبہ سیاسیات ہو یا معاشیات، اقتصادیات ہو یا نفسیات ہر جگہ لوگوں کا ایک اژدہام نظر آتا ہے۔ لیکن جب ان کے قول وفعل میں تضاد نظر آتا ہے، ان کے ظاہر اور باطن میں تفاوت دکھائی دیتا ہے، ان کی منافقت مترشّح ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ تو پھر زبان دل کی رفاقت میں یہ پکار اُٹھتی ہے کہ ''آدمی ہیں بے شمار مگر انسان کوئی نہیں''

قلت معدوم کے ضمن میں گردانی جاتی ہے۔ اگر چہ مایوسی نہیں شجر اُمید کے سائے کے متلاشی ہیں اور انسانیت کی خلعت فاخرہ زیب تن کرنے والی نابغۂ روزگار ہستیوں کے وجود کا یکسر انکار نہیں ہے تاہم معاشرے کے آنگن میں انسانیت کے تاج سے مزیّن لوگوں کی اشد ضرورت ہے تا کہ

ملّت میں، قوم میں، معاشرے میں عظیم لوگوں کا وجود انسانیت کے گلشن میں بادِ نسیم کے جھونکوں کا سبب بن سکے۔ میدانِ انسانیت کے شاہسوار معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

تعلیمی انقلاب تقاضائے وقت

ہر انسان زندگی کو احسن طریقے سے گزارنے کا آرزومند ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ایّام زیست میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، اس کے لیل ونہار اس انداز سے گزریں کہ غم واندوہ کے لمحات کا ان میں شائبہ تک نہ ہو۔ اس کے دماغ کے تمام حصے اپنے اندر اطمینان محسوس کریں۔ اس کی زندگی میں انقلاب آجائے۔ دوست تو دوست دشمن بھی اس کی مصاحبت کو فخریہ انداز میں پیش کریں۔ اس کی نشست وبرخاست، اس کے قیام وقعود، اس کے اخلاقی معیار انفرادی حیثیت کے حامل ہوں۔

زندگی کے جملہ شعبوں میں ہی انقلاب برپا ہوسکتا ہے، جملہ شعبہ ہائے زیست میں تبدیلی آسکتی ہے لیکن اس کے لیے درعلم ومعرفت پر دستک دینا ہوگی۔ ان لوگوں کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کرنا ہوگا جن کے قلوب واذہان اور دل ودماغ میں نورِ علم کی کرنیں پہنچ چکی ہوں گی اور جن لوگوں سے علم ودانش کی روشنائی سے لوحِ جہالت پر مفید عبارتیں رقم کی ہوں گی۔ وہ نابغۂ روزگار ہستیاں جنہوں نے علم سے محبت کی، علم سے ہمہ وقت مربوط رہے، شجرِ علم سے پیوستہ رہے، اپنے گلستانِ قلب وذہن میں علم وآگہی کے گلہائے رنگارنگ کھلاتے رہے، اپنے چشمہائے بینا میں سرمۂ علم ومعرفت سے نورِ بصیرت کا اضافہ کرتے رہے۔ آج ہماری تاریخ ان نفوسِ قدسیہ کے وجودِ مسعود کے تذکرے سے اپنے اوراق مزیّن دکھارہی ہے۔ اپنے اپنے دور میں یہ لوگ زیورِ تعلیم سے مرصّع ہوکر عوام النّاس کی خدمت کو اوّلین فریضہ گردانتے تھے، اس دور کے بزرگ اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے اور عمر میں چھوٹے بڑوں کو احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھنا باعثِ شرف سمجھتے تھے۔ ان کی زندگیوں میں حسن وجمال علم ومعرفت کے آفتاب نصف النہار کی

بدولت ہوتا ہے۔

کسان اگر یہ چاہتا ہے کہ اس کی فصل کاشت سے لے کر برداشت تک تمام مراحل میں معیاری نظر آئے، اس کے لہلہاتے کھیت، عظیم مناظر کا مظاہرہ کریں، اس کے سرسبز وشاداب کھیت اور سونا اگلتی ہوئی زمین اس کی فصل کے بارے میں معلومات کا عملی نمونہ پیش کرے تو اس کو شیوہ فرسودہ کو ترک کر کے جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگی اختیار کرنا پڑے گی، فصل کے ابتدائی مرحلوں سے لے کر انتہا تک اس کی حفاظت کے لیے اس کو آسمانی آفتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے، اس کو زمینی بلاؤں کے خونخوار پنجوں سے مامون رکھنے کے لیے اپنے دماغ کے دریچوں کو سائنسی معلومات کے لیے وا رکھنا ہوگا۔ ہماری معیشت کا زیادہ دارومدار زراعت پر ہے اور زراعت میں کامیابی و کامرانی کی منازل طے کرنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے واقفیت جزولاینفک ہے۔

جس قوم کے نوجوان میں شعوری قویٰ بیدار ہوتی ہیں، ان کی حیات میں تفاوت واضح ہوتا ہے ان کی معاشرے کے افراد سے تعلقات کی نوعیت سطحی نہیں ہوتی، ان کی زندگی کے منفرد اندازِ حیات سے دیگر اقوام سبق حاصل کرتی ہیں۔ اقلیم علم و دانش پر فرمانروائی کرنے والے عظیم افراد معاشرے کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ انسان اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ واقعی منصب عزت وعظمت پر فائز ہو، اس کے زندگی کے جملہ گوشے روشن اور منور ہوں، اس کے زیر کفالت پرورش پانے والے افراد اس کی توجہ کے ہمہ وقت منتظر ہیں اس کے افعال واقوال میں توازن کی فضاء برقرار رہے، اس کے ماحول کو اپنانے میں ہر کوئی سبقت لینے کے لیے تگ ودو میں مصروف رہے تو پھر اس کو اپنے در و دیوار کو آفتاب علم و دانش کی نور فشاں کرنوں سے منور کرنا ہوگا۔ اس میدانِ شعور و آگہی میں شاہسواری کے گر سیکھنے ہونگے۔ تعلیمی انقلاب ہی تو ہے جو ترقی وعروج کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے، ایک ادارہ کے معلم میں جب ہوش وخرد کے گلستان میں چہل قدمی کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اور غفلت کے پردے چھٹ جاتے ہیں، اور علم کے زیور سے مزیّن ہونے کی جستجو انگڑائیاں لینا شروع کر دیتی ہے۔ تو پھر اس کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ اس کی زندگی میں انقلاب آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت میں نکھار آنا شروع ہو جاتا ہے، اس کے گھر کے آنگن میں پھیلے ہوئے جہالت کے شجر خاردار پر خزاں آنا شروع ہو جاتی ہے، اور وہ ایک عظیم

شہری، ایک عظیم محبّ وطن، ایک عظیم حاکم بلکہ ان سب سے بڑھ کر ایک عظیم مسلمان کے روپ میں منظر عام پر جلوہ گر ہوتا ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

قرآنِ پاک میں جہاں ''علم والے اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے'' کے الفاظ درج ہیں وہاں ''رب زدنی علما'' کی شکل میں زبان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ادا کیے ہوئے الفاظ بھی اپنی سج دھج سے موجود ہیں۔ علم ہی کے ذریعے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس دنیا کی عظیم ترین ہستی جب اپنے خالق حقیقی کے سامنے کسی عظیم خواہش کا اظہار کرتی ہے تو وہ علم ہی ہے اور علم ہی کے لیے اپنی شخصیت کو مزید نکھارنے کی آرزومند ہے۔ یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح متبیّن اور واضح ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دیگر اقوام میں ہمارا سر بھی فخر سے اونچا ہو، ہماری مصنوعات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے، ہمارے رسم ورواج کی پیروی کرنے کے لیے سرمایہ صرف کیا جائے اور ہم دیگر معاشروں اور اقوام کے لیے نمونہ ثابت ہوں، تو پھر ہمیں اپنی علمی درسگاہوں میں اضافہ کرنا ہوگا، ہماری جامعات، ہمارے ادارے اور ہمارا اعلیٰ ماحول ہی ہمارے حال، مستقبل کو درخشاں کر سکتا ہے اس وقت علم ہی کے ذریعے ہی ہم غیر ملکی اقوام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں۔ یہ بات ماننا انتہائی ناگزیر ہے تعلیمی انقلاب ہی کے ذریعے جملہ تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے اور تعلیمی انقلاب ہی وقت کا تقاضا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

مسلسل جدوجہد کامیابی کی کنجی ہے

ایک بچہ ہاتھ میں کتابوں سے بھرا بیگ اٹھائے خراماں خراماں گاؤں کے مشرقی کونے پر موجود سکول کی جانب جا رہا تھا۔ چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں تھے۔ کسی منزل پر پہنچنے کا شوق دامن گیر تھا، اپنے بوڑھے والدین اور بہن بھائیوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیش نظر تھا۔ یہی شوقِ تعلیم اس کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے مدد و معاون ثابت ہوسکتا تھا۔ اس کے شب و روز حصول مقصد کی لگن میں گزر رہے تھے۔ دریں اثناء اچانک جاں گسل صدمہ پیش آیا اور اس کے ارمانوں پر پانی پھیر گیا۔ آفت آسمانی سیلاب کی صورت میں اس کے گھر کو قبرستان بنا کر چلی گئی۔ اور گھر کا جملہ سامان عذاب کی صورت میں آنے والے سیلاب نے ختم کر دیا۔ اپنی اس گفتگو کے دوران اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی شکل میں نمی کے آثار نمایاں تھے۔ عظیم منصب پر فائز شخص نے موونگ چیئر پر اپنے جسم کو دائیں بائیں متحرک کرتے ہوئے اپنی کامیابی کے راز کو فاش کیا اور کہا کہ شوق اگرچہ کامیابی کے لیے یوں ہے جیسے مچھلی کے لیے پانی، زندہ رہنے کے لیے خوراک، اور سانس لینے کے لیے ہوا، لیکن شوق کے ساتھ محنت اور مشقت نہ اٹھائی جائے تو صرف شوق بلبلہ بر آب ثابت ہوگا۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ استقامت کرامت سے بھی بڑھ کر ہے۔ ایک شخص محنت شاقہ کا بار گراں اُٹھاتا ہے لیکن اس میں بے قاعدگی کا عنصر موجود ہے، باقاعدگی اور تسلسل کا فقدان ہے تو اس کی محنت رنگ نہیں لائے گی، اس کے گلشن میں بہار نہیں آئے گی، اس کے کھیت وکھلیان کشتِ زعفران کا نمونہ پیش نہیں کریں گے، اس کے طائران خوش الحان کی نغمگی میں ترنم نہیں ہوگا۔ اس کے چمنستان وگلستان میں بجائے گلہائے رنگارنگ کے خس وخاشاک ہوگا۔

ایک قاضی اور منصف جب رات گئے تک قانون کی کتابوں کے مطالعہ میں مستغرق رہتا ہے طائر فکر ظالم کے ظلم سے مظلوم کو بچانے کے لیے محو پرواز ہوتا ہے۔ اس کے شب و روز اپنے پیشے سے وفاداری میں گزرتے ہیں، وہ اپنی کامیابی کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تو ایک دن ایسا آتا ہے کہ اس کے اندر کا قاضی میدان عدل وانصاف کا شاہسوار بن جاتا ہے۔ اس کے بے لاگ فیصلے مظلوم کی دادرسی کا حق ادا کر دیتے ہیں، اس کے جملہ امور سخت جدوجہد اور محنت شاقہ کے باعث بحسن وخوبی سرانجام پاتے ہیں۔

محنت جہاں بھی ہوتی ہے اپنے اثرات چھوڑتی ہے، محنت اور جدوجہد کا پھل نسلیں کھاتی

ہیں۔محنت ومشقت سے لگائے گئے شجر سایہ دار کے سائے میں ٹھنڈک زیادہ ہوتی ہے۔سعی مسلسل سے لگائے گل سرسبز کے خارنو کدار نہیں ہوتے اور ایسے از ہار میں مہک کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے، محنت شاقہ کے شائق مالی کا باغ ماحول میں نکھار کا باعث ہوتا ہے، اور اس کے ناظرین اور آنے والے سیاحوں کے قلوب واذہان میں طراوت پیدا ہوتی ہے۔

محنت ایک ایسا پھول ہے جو کبھی مرجھاتا نہیں ہے، اس کی نازک پتیوں پر بھی مردنی نہیں چھاتی۔محنت ومشقت ایک ایک ایسا بارآور درخت ہے جو کبھی خزاں آشنا نہیں ہوتا، مشقت کا لباس ایک ایسا لباس ہے جو ستر غربت ثابت ہوتا ہے۔یہ ایک ایسا نشتر ہے جو غربت وافلاس کے ناسور کو ختم کر کے دم لیتا ہے، زندگی مشکلات اور پریشانیوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر وقت الجھنیں اور بلائیں سایہ کی طرح پیچھے لگی ہوتی ہیں۔دل ودماغ میں قوت غور وفکر ناپید ہے، معاشی طور پر کمزور انسان تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے، احباب کی اکثریت معدودے چند کو چھوڑ کر خود غرضی کے دام ہم رنگ زمین کا نمونہ پیش کر رہی ہیں۔"الصدیق وقت الضیق "والی بات اب نہیں ہے، دوست جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔اور مختلف بہانے بنا کر اس سے ملنا جلنا بند کر دیتے ہیں لیکن اس وقت بھی ہوش وخرد کے ساتھ ساتھ امید اور محنت کا رسیا اور متوالا شخص اس قسم کے گرداب سے اپنے آپ کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے عہدے، بڑے بڑے منصب شب وروز کاوش کرنے والے، جہد مسلسل کے عادی، انتھک محنت کے خوگر لوگوں کے دروازے کی دریوزہ گری کرتے نظر آتے ہیں۔اور جو محنت کو چھوڑ دیتے ہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے من وسلویٰ کا انتظار کرتے رہتے ہیں، غفلت اور سستی ان کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔زندگی کے حسین لمحات ان سے روٹھ جاتے ہیں۔اور امن وآشتی کی فاختہ کسی غیر کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے۔

یہ جملہ گفتگو میں بڑے انہماک کے ساتھ سنتا رہا اور اس کی کامیابی کے راز میری آنکھوں کے سامنے گردش کرتے رہے۔ میں اس کی تمام گفتگو اور پر مغز اقوال کو اپنے ذہن میں مسلسل دھراتا رہا بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا کہ کائنات کی تمام رنگینیاں، رعنائیاں، دلآویزیاں محنت ومشقت کی ہی مرہون منت ہیں، اور مسلسل جدوجہد ہی کامیابی کی کلید ہے۔

وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
محنت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

☆☆☆☆☆☆☆☆

حقوق انسانی کا اسلامی تصور

ہر مذہب میں حقوقِ انسانی پر اپنے اپنے طریقہ کار کے تحت زور دیا گیا ہے، دنیا کے تمام مذاہب کسی نہ کسی طور پر حقوق انسانی کا پرچار کرتے ہیں، حقوقِ انسانی کو اسلام میں جو اہمیت دی گئی ہے اس کا کوئی تصور اس سے قبل کسی شریعت یا معاشرے میں نہ تھا۔ اسلامی شریعت اس کی تلخیص کچھ یوں پیش کرتی ہے ''دردل کے واسطے پیدا کیا انسان کو'' اگر کوئی محتاج ہو تو اس کی احتیاج دور کرنا، اگر کوئی بیمار ہے تو اس کی عیادت کرنا، بیواؤں کی سرپرستی، یتیموں کی پرورش، مجبور و معذور افراد کی دستگیری، ان پڑھ لوگوں کی تعلیم کا انتظام ایسے ہمہ قسم انتظامات اور معاملات اسلامی شریعت میں بہترین عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں یہ تاکید ہے کہ کوئی ہمسایہ بھوکا نہ رہے، اگر خود پیٹ بھر کر کھالیا اور پڑوسی بھوکا رہ گیا تو یہ کھانا ناجائز ہوگا۔

انسان کے حقوق کی ادائیگی اور ہر لحاظ سے انسانوں کا احترام کرنا اور ان کی عزت کا خیال رکھنا، اسلامی تعلیمات اس سے معمور ہیں۔ جو انسان حقوق العباد کی ادائیگی کے منصب رفیعہ پر متمکّن ہوتے ہیں وہ آسمانِ عظمت و رفعت پر آفتاب نصف النہار کی طرح چمکتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہوتے ہیں کہ جو اپنے آرام و آسائش کو چھوڑتے ہیں اور بہ کمال ایثار دوسروں کے کام آتے ہیں۔ ایسے ایثار اور محبّ انسان و انسانیت لوگوں کو اسلام ارفع مقام عطا فرماتا ہے اور ان کی رفعت و عظمت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر ہم کو اپنے ماحول اور اپنے معاشرے میں غربت و جہالت ملتی ہے اور معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ضرورت مند اور یتیم محتاج موجود ہیں، اگر ہماری نگاہیں بداخلاقیوں کو دیکھ رہی ہیں اور اگر ہمارا دل اس بات کا شاہد ہے کہ معاشرہ میں فسق و فجور موجود ہے اور کوئی معذور عدم توجہی کا شکار ہے تو باور کرنا چاہیے کہ ہم نے اپنے معاشرے اور سوسائٹی کو قالب اسلام میں ڈھالنے میں تساہل اور غفلت سے کام لیا ہے اور ہمارا دین ایسے حالات میں ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم تعلیمات اسلام سے روشنی حاصل کریں اور اپنے ماحول اور معاشرے کو تمام گندگیوں، خباثتوں اور اخلاقی غلاظتوں سے پاک کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں اسلام پہلا اور آخری دین ہے جس نے انسانوں کے مختلف رشتوں کے فطری تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان کی اولیت متعین کر دی ہے۔ حقوق العباد کی ادائیگی کا یہ طریقہ کہ والدین اور اعزّہ محروم رہیں، لیکن دوسرے مستفید ہوں اسلام کی نظر میں مستحسن نہیں ہے۔ اسلام اس قسم کے غیر انسانی اور غیر فطری سلوک کا قائل نہیں ہے۔ اسلام حقوق کی ادائیگی میں نسبی اور خاندانی قربت کو ترجیح دیتا ہے۔ تمام بندوں کے حقوق

ادا کیے جائیں اور وہ ترتیب اور درجہ بندی ملحوظ رکھی جائے جو اسلام نے مقرر کی ہے، اگر کوئی شخص والدین کے حقوق ادا نہ کرے، قرابت داروں کے ساتھ احسان نہ کرے، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کا خیال نہ کرے، مسافروں کا مداوا نہ کرے، ملازموں کو آزادی دلانے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کو ذلت و رسوائی اور غلامانہ ماحول سے نکالنے کی کوشش نہ کرے تو وہ دوسروں پر احسان و کرم کی جتنی بھی بارش کرے، حقوق العباد کے اسلامی شریعت کے مطابق ادا نہ کرنے کا مجرم ضرور قرار پائے گا۔ اور اس کی مثال بارش کے اس پانی کی سی ہوگی۔ جو پہاڑ اور بنجر زمین پر برسے اور پیداواری زمین قحط سالی کا شکار ہو رہے۔

قرآنِ حکیم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا کہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ آمدنی کا کتنا حصہ دوسروں پر خرچ کریں، اے میرے نبی فرما دیجئے کہ جو کچھ بچ رہے دوسروں کو دے دیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دولت لٹا کر خود بھی ''مسائل محروم'' کے زمرے میں شامل ہو جاؤ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنے آپ کو مشکل میں ڈالے بغیر اپنی آمدنی کا جتنا حصہ دوسروں پر صرف کر سکتے ہو کرو، لطف یہ ہے کہ اسلام ہی نہیں کہتا کہ تم احسان کر رہے ہو بلکہ وہ اصرار کرتا ہے کہ بندوں کا حق ادا کرنا بندوں پر فرض ہے، اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و پیروی کا عملی طریقہ ہے۔ اسلام اس بات کا شدت سے متمنی ہے کہ والدین کے ساتھ بھلائی کی جائے، اولاد کے حقوق ادا کئے جائیں ان کی تعلیم و تربیت کا خاصا خیال رکھا جائے، یتامیٰ کے سر پر دست شفقت رکھا جائے، مساکین اور فقراء کے چولہوں کو روشن رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے، بیمار انسانیت کے لیے مسیحائی کا فریضہ بحسن و خوبی ادا کیا جائے، عہدِ نبوی ہو، دورِ صحابہ ہو، زمانہ تابعین ہو، امام تبع و تابعین ہو، دور سلف صالحین ہو ہر لمحہ حقوق انسانیت کی ادائیگی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اسلامی احکامات سے دینی کتب بھری پڑی ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد میں حقوق اللہ کی تلافی خالق کائنات کی شان کریمی اور رحیمی کی بدولت ممکن ہے لیکن حقوق العباد کی ادائیگی میں اگر کوتاہی ہوگئی ہے تو پھر اس کی تلافی متعلقہ فرد سے مشروط ہے کہ اگر وہ معاف کر دے تو معافی ہو جائے گی ورنہ اس شخص کی یہ خطاء معاف نہ ہو سکے گی۔ حقوق انسانی کا جتنا لحاظ اسلام نے رکھا ہے دیگر مذاہب اور ادیان اس سے قاصر ہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع میں انسانی حقوق کی بابت جو وضاحت کر دی گئی ہے۔ یو۔ این۔ او اور اس کے تحت کام کرنے والی تمام این۔ جی۔ اوز جو اپنے آپ کو حقوقِ انسانیت کا تقریباً چیمپئن سمجھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسلام کے جملہ احکام انسان ہی کو شرفِ انسانیت بخشنے کے لیے ہیں۔ اور اس سے استفادہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔